

ڈاکٹر
عبادت بریلوی

کتاب

عقائد



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پر رابطہ کیجیے۔ شکریہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی




غالب کا فن



ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

تصنیف : غالب کافن
 مصنف : ڈاکٹر عبادت بریلوی
 ناشر : ادارۃ ادب و تنقید لاہور
 سرورق : سید نور حسین شاہ لغیس رقم
 اہتمام : سید محمد ابراہیم خوش نویس لاہور
 مطبع : لاہور آرٹ پریس، لاہور
 جلد سازی : مدنی بک بائینڈنگ ہاؤس - لاہور

قیمت : 
 پہلے روپے
 تاریخ اشاعت : جولائی ۱۹۸۰ء





مزاج دان فکر و فن غالب

برادر گرامی قند

جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب

کی شذر

خوشا لطافتِ اندازۂ ادائیگی
نیجے نزاکتِ اندازۂ مدعا دانی

(غالب)



ترتیب

۷	پیش لفظ	
۱۱	اہمیت	۱
۱۶	حوالہ اور عزاکات	۲
۳۱	موضوع اور فن کی ہم آہنگی	۳
۶۹	وزن و آہنگ	۴
۱۰۵	روایت کے اثرات	۵
۱۲۹	علامات و اشارات	۶
۱۴۵	رمزیت اور ایمائیت	۷
۱۶۵	تصویر کاری اور پیکر تراشی	۸
۲۱۷	زبان و بیان	۹
۲۶۲	ما حوصل	۱۰
۲۷۹	اشاریہ	

پیشے لفظ

غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کی اس عظمت کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی روایت میں ایک نئی روح بھونکی ہے۔ اس کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ اسی میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا ہے۔ تبدیلی کی ایک نئی لہر دوڑائی ہے۔ اُس کو نئے راستوں پر گامزن کیا ہے۔ نئی منزلوں کی طرف بڑھایا ہے بلکہ نئے آسمانوں پر پرواز سکھائی ہے۔ وہ اردو شاعری کے مجتہد بھی ہیں مجدد بھی۔ اُن کا بنیادی موضوع انسان اور انسانیت ہے۔ انہوں نے اسی انسان اور انسانیت کے بنیادی انفرادی اور اجتماعی مسائل و مسائل کو بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ اس طرح اردو شاعری اُن کے استوں ایک آفاقی رنگ اور ایک بکری آہنگ سے

آشنا ہوئی ہے اور اس کو ایک ذہن و شعور ملا ہے۔ وہ
 اژدہ کے چلے فلسفی شاعر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری صرف فلسفہ نہیں
 ہے۔ اس فلسفے کو آئینوں نے تجربے کے سانچے میں کچھ اس طرح
 ڈھالا ہے اور تخیل کے رنگوں سے اس کو کچھ اس طرح سجاا ہے
 کہ اس میں حسن و جمال کی ایک دنیا آباد ہو گئی ہے۔ اور حسن و
 جمال کی اس دنیا نے انہیں ایک ہیئت بڑا فن کار اور ایک
 اعلیٰ درجے کا خالقِ جمال ثابت کر دیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ گزشتہ سو سال میں غائب کی شخصیت
 اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر عیسویوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور
 سینکڑوں مضامین و مقالات قلم بند کئے جا چکے ہیں لیکن ان کی
 فن کاری اور تخلیقِ جمال کے پہلو پر ان کتابوں اور مقالوں میں
 کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ کہیں کہیں ان کی فن کاری کا
 ذکر ہوا ضرور ہے۔ اس کی تحسین و تشریف میں چند فقرے اور
 جملے بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان پہلوؤں کا تنقیدی تجزیہ کسی
 طرح ہونا چاہیے تھا، نہیں ہو سکا ہے غائب کی شخصیت اور
 شاعری کے متعلق تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کا مطالعہ کرتے
 وقت یہ کمی کاٹنے کی طرح کھٹکتی ہے۔

اس احساس ہی نے میرے دل میں اس خیال کی شمع
 روشن کی کہ میں غائب کی تخلیقِ جمال کے عوامل اور محرکات کا
 سراغ لگادوں اور اس کے مختلف عناصر کا تنقیدی تجزیہ کروں۔
 یہ کتاب "غائب کا فن" ان کے اسی تخلیقِ جمال کے عوامل و

حرکات کی تلاش و جستجو کی ایک داستان اور اس کے مختلف عناصر کے تنقیدی تجزیے کی ایک کہانی ہے۔

اس کتاب کو آسانی کے خیال سے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں غالب کے فن کی اہمیت کا منظر سا بیان ہے۔ دوسرے باب میں ان مراحل اور حرکات کی تفصیل ہے جن کے استوں غالب کے فن کی تشکیل ہوئی ہے۔ تیسرے باب میں موضوع اور فن کی اس ہم آہنگی کا ذکر ہے جس سے غالب کا فن پہچانا جاتا ہے۔ چوتھے باب میں وزن و آہنگ کی تفصیل ہے اور اس حقیقت کا حائزہ ہے کہ اس وزن و آہنگ نے غالب کے فن میں کیا کام کیا ہے۔ پانچویں باب میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ روایت کے اثرات نے غالب کے فن کو کس طرح متاثر کیا ہے اور اس نے ان کی شاعری میں کیا صورتیں اختیار کی ہیں۔ چھٹے باب میں علامات و اشارات کے جہازاتی پہلوؤں پر تنقیدی بحث ہے۔ ساتواں باب رمزیت اور ایمائیت کی جہازاتی اہمیت کی وضاحت کرتا ہے۔ آٹھویں باب میں غالب کی تصویر کاری، پیکر تراشی یا امیجری پر تفصیل بحث کی گئی ہے۔ اور ان کی شاعری کے بعض ایسے پہلوؤں کی کتاب کشائی کی گئی ہے جن کی بدولت ان کا فن ایک اچھا خاصا منظر خانہ بن گیا ہے۔ نویں باب میں زبان و بیان کے جہازاتی پہلوؤں کا تنقیدی حائزہ لیا گیا ہے اور دسویں باب میں اختصار کے ساتھ اس تنقیدی بحث سے نکلنے والے آن

تمام نتائج کو یک جا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے
 مزوت اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا سا بلند پایہ
 خالق ہمال اور اعلیٰ پائے کا فن کار اردو شاعری میں کوئی
 اور پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ غالب
 کے بعد جتنے بھی اہم شاعر گذرے ہیں انہوں نے کسی نہ کسی
 ذریعے سے غالب کا اثر قبول مزد کیا ہے۔

غالب کے فن اور ہایاتی پہلو کے اس تنقیدی جائزے
 کو مکتی نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے اپنی سی پوری کوشش مزد
 کی ہے کہ غالب کے فن کے تمام خدوخال اس جائزے سے پوری
 طرح نمایاں ہو کر سامنے آسکیں۔ اس کوشش نے اس تنقیدی
 جائزے کو مکمل اور بھرپور نہ سہی لیکن ایک معقول اور بڑی
 حد تک صحیح مطالعہ مزد بنا دیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ
 اس میں تفصیل و جزئیات کے عناصر نسبتاً زیادہ نمایاں ہو گئے
 ہیں۔ جنہیں بھی طویل ہو گئی ہیں۔ تجزیے میں بھی کچھ پھیلاؤ
 پیدا ہو گیا ہے۔ اشار کا انتخاب بھی کچھ بڑھ گیا ہے۔
 لیکن اس قسم کے تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے میں ان پہلوؤں
 کا پیدا ہونا ایسی کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ تنقیدی خیالات
 کی وضاحت کے لئے اشار کا انتخاب مزدی ہوتا ہے۔ اس
 کو مختصر بھی کیا جا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا ہے۔
 کیونکہ میرے خیال میں اشار کے انتخاب کی تنقیدی اہمیت
 بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اس قسم

کے تنقیدی جائزے میں شاعر کے اشعار دلوں میں فور اور ہلکوں میں سرد پیدا کرنے کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ تنقید اس صاف میں ہے جس سے۔

اس تنقیدی جائزے میں جو رنگ و آہنگ ہے وہ اردو تنقید میں عام نہیں ہے۔ انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں تو اس قسم کے تنقیدی جائزوں کی خاصی فراوانی ہے لیکن اردو میں ان کی کوئی اہم روایت نہیں ملتی۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس تنقیدی جائزے کی حیثیت ایک تجربے کی ہے۔ تجربہ نقشِ اول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نقشِ اول میں غالب کے فن اور اس کے جالیات پہلوؤں کی طرف بعض چند اشارے کئے گئے ہیں۔ صرف اس خیال سے کہ ان اشاروں کو سامنے رکھ کر دوسروں کو اس راستے پر گامزن ہونے، آگے بڑھنے اور نئی منزلوں سے ہلکار ہونے، بلکہ نئے آسمانوں پر پرواز کرنے کا موقع ملے گا۔

اور اس طرح وہ کارنامے جو غالب نے اردو شاعری میں انجام دیے ہیں اور ان کے اہل فنوں غفلت کی جرح اس کی روایت کے شبستاروں میں فروزاں ہوئی ہے وہ اردو تنقید کے ایوانوں کو بھی اپنی مسکراہٹ سے جگمگائے گی۔

۱۴۰۲

غالب کی حیثیت آردو شاعری کے آفاق پر ایک ایسے درخشاں ستارے کی ہے جس کی دل نشیں مہتر مہتر اہٹ ہر حال میں دلوں کو بھاتی ہے ۔ وہ صبح مسنون میں عظیم شاعر ہیں ۔ اور ان کی اس عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں ۔ اس کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں ۔ اس کے بنیادی مسائل و مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں ۔ اس کی ان گنت گہنیوں کو بھاتے ہیں ۔ انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں ۔ اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں اور نغمہ حیات و سواد کائنات میں اس کو نئے آسمانوں پر اڑاتے ہیں ۔ غالب کی شاعری اس اعتبار سے بہت بلند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کے انہیں عناصر نے اس کو عظمت سے بکنار کیا ہے لیکن جس طرح ان کی شاعری میں

ان سب کا انہار و ابلاغ ہوا ہے، وہ بھی اس کو عظیم بنانے میں برابر کا شریک ہے۔

یہ انہار و ابلاغ حسیں و دل آویز ہے۔ اس میں سخن کی ادب و آہار ہیں۔ جمال کے اعلیٰ میار ہیں۔ ان میں بڑی ہی رنگینی اور رحمتائی ہے۔ بڑا ہی چمکار انداز ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک چمکی ہوئی چاندنی کا سا منظر نظر آتا ہے۔ آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کی سی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ کسی شہر میں چراغوں کی سی کیفیت کا سا معلوم ہوتا ہے۔ قدم قدم پر اس میں گل و گلزار سے بکھٹے ہیں۔ کلیاں سی چمکتی ہیں۔ پھول سے مسکراتے ہیں۔ جڑ خانوں سے جگمگاتے ہیں۔ اس میں ایوانوں کی سی رنگینی ہے۔ شبستانوں کی سی پرکاری ہے۔ اس میں رنگ کے طوفان سے آہٹتے ہیں۔ فود کے سیلاب سے اُڈتے ہیں۔ اور جگہ جگہ برسات کے دفوں میں شام کے وقت دور مزب میں آفتاب پر پھولی ہوئی کشفیق کا سا عالم نظر آتا ہے۔

ان باتوں میں شاعرانہ رنگ اور آثرائی آہنگ مزور ہے لیکن مبالغہ نہیں ہے۔ کیونکہ غالب کی شاعری پڑھنے اور سننے والے کے سامنے یہ اور اسی قسم کے ان گنت پیکروں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اثر احساس پر شدید ہوتا ہے۔ وہ ان میں غیر شعوری طور پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اس ارتعاش کی وجہ سے اس کے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن پر اس قسم کی تصویریں ابھرتی ہیں۔

غالب کا انہار و ابلاغ اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح

ہم آہنگ ہے۔ ان کے موضوع میں جو دستیوں اور گہرائیاں ہیں، اس کا عکس ان کے اعداد و ابلخ میں بھی نظر آتا ہے۔ اُن گنت عناصر کے امتزاج سے اس کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس میں غالب کے تجربے کی کیفیت، جذبات و محسوسات کا مخصوص آہنگ، ادراک و شعور کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ایک سنجیدہ انداز، سنجیدہ اور ستر در تدریقات کے باعث پیدا ہونے والی مخصوص رمزیت اور ایمائیت، خلقت و اشارات، استعارات و تشبیہات، تصویر و پیکر اور الفاظ و زبان اسب ہی کچھ شامل ہیں۔

ان تمام عناصر کے مجموعی اور متوازن امتزاج کا نام غالب کا فن ہے جس میں ایک عظیم اور پہلو دار شخصیت کی عکاسی اور ایک رنگین اور پُرکار تہذیب کی ترجمانی خود حسن و جمال کی اقدار کو چار سپاند لگاتی ہیں۔

عوامل اور محکات



عالم کے ہر ایک فرد کو ایک مخصوص تہذیبی روت نے پیدا کیا ہے۔
 اس کی نہر و تہذیب میں وہ معاشرتی و ہندسی اور ذہنی و فکری عادت
 بھی برکے شریک ہیں جن کے سارے میں اس نے آنکھ کھولی ہے
 اور اسے سفر کی تھکن منوریں ملے کی ہیں۔ وہ غالب کی شخصیت کا
 آئینہ ہے اور اس آئینے میں نہ صرف ان کی شخصیت کے خدوخال
 چمکی طرے سے غالب نظر آتے ہیں بلکہ ان حالات کی تصویر بھی دکھائی
 دیتی ہے جن کے باعث غالب کی شخصیت کا بیوہ تیار ہوا ہے۔

یہ ایک انی حوالہ نام ہے کہ غالب اس تہذیب کی انہری
 یادگار ہیں جس کو اس بزرگمیں میں منوں نے پیدا کیا اور پروان چڑھایا
 تھا اس میں شہر نہیں کہ حمد اکبری اور حمد شایہ جانی میں یہ تہذیب
 اپنے مروج شباب پر نظر آتی ہے۔ اور نگ تہذیب عالمگیر کے زمانے

میں بھی کم و بیش یہی عالم رہتا ہے لیکن اس کے بعد اس میں انحطاط و زوال کے آثار رونما ہونے لگتے ہیں۔ مٹلوں کے دورِ آخر میں انحطاط و زوال کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور غالب کے صد تک آتے آتے تو یہ حمایت انتہائی بوسیدہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ البتہ اس کے باوجود در زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ یہ ایک عظیم اور شاندار حمایت تھی۔ چنانچہ جو رُگ اس حمایت کے وارث تھے، ان کے یہاں اس کی عظمت کا احساس بڑھ جاتا ہے، اور جو روایات اس کے سائے میں پل بڑھی اور پروان چڑھی تھیں، ان کی اہمیت کے احساس و شعور میں کچھ اس درجہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ انہیں سینے سے چھٹاتے رہتے ہیں اور کسی حال میں بھی اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

غالب اس صورتِ حال کے صحیح ترجمان اور عکاس ہیں۔ انیسویں صدی کی دہائی میں سببِ مسلمان سیاسی میدان کو تقریباً چھوڑ چکے تھے اور منسل بادشاہ کی حکومت صرف اہلِ کلیے کے اندر محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ غالب اور ان کے ہم عصروں نے تہذیبی روایت کی اس شمع کو فروزاں رکھا جس نے ماضی میں اس برعظیم کی پوری زندگی کو رنگین اور پُرکار بنا دیا تھا۔ غالب کے زمانے میں اس تہذیبی روایت کی تدابیر بھی اپنے معراجِ کمال پر نظر آتی ہیں اور یہ صرف غالب اور ان کے بعض ہم عصروں کا کارنامہ ہے کہ حالی نے اس دور میں ایک دندہ پھر حمدِ اکبری اور حمدِ شاجہانی کی جھلک دکھائی ہے۔

اس تہذیب میں جو جذبی اور ترقی ہے، جو رنگینی اور پرکاری ہے، جو جگمگاہٹ اور تابانی ہے، جو رُس اور رعنائی ہے اس

کو ساج مل ، مال تلو اور جامع مسجد کے در و دیوار اور فیضی ، سرفی
 نفیری اور بیدل کے اشعار میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ غالب کے فن
 اور ان کی شاعری کے جمالیاتی اظہار میں بھی اس تہذیبی روایت کی
 جھلک اپنی تمام جلوہ سالانہوں کے ساتھ بے نقاب دکھائی دیتی ہے۔
 ان کے فن میں جو ایک رنگین اور پرکاری ، جگمگاہٹ اور تابانی اس
 اور رعنائی ہے ، وہ اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔ غالب کے یہاں اس
 تہذیبی روایت کے گہرے اثرات صرف اس وجہ سے نظر آتے ہیں کہ
 اس دور میں اس روایت کی عظمت کا احساس افراد میں کچھ زیادہ ہی
 شدید ہو گیا تھا۔ اغلاط و زوال جب انتہا کو پہنچ جاتے تو یہی صورت
 حال پیدا ہوتی ہے۔ غالب اس کے یکے علم بردار ہیں اور ان کا فن اور
 جمالیاتی اظہار اس کا صحیح آئینہ دار :

یہ تہذیبی روایت بقول حالی صد اکبری اور حمد شاہجہانی کی یاد
 اس وجہ سے بھی دلاتی ہے کہ اس زمانے میں اپنے آپ کو پانے اور
 اپنی سیاسی اور تہذیبی عظمت کے جگر لعنت لعنت کو ایک دفتر پھر
 جمع کرنے کی کوشش یعنی ایسی تحریکوں کی صورت میں موجود تھی جی
 کی نوعیت بریک وقت سیاسی اور ساشرتی بھی تھی اور دینی و
 تہذیبی بھی۔ ان میں مولانا سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی
 تحریک ہمد کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس تحریک نے مجموعی
 طور پر اس معاشرے میں جو ماحول پیدا کیا تھا ، اس کے اثرات
 غرضیں تک پر موجود تھے۔ غالب کو مولانا سید احمد بریلویؒ کی تحریک
 سے انتہات تھا۔ وہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے دوست اور ہم فو

تھے لیکن جوہنی اور داور انگیزی کی جو فضا اس تحریک نے اس زمانے کی دہائی میں پیدا کر دی تھی، اس نے غالب کو بھی متاثر کیا اور ان کے فن میں باوجود غم عشق، غم حیات اور غم روزگار کے پیدا ہونے والی اہم انگیزی کے۔ وہ جو ایک داور انگیزی اور مدنی مکتبی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک سنگتگی اور شادابی کا جو احساس ہوتا ہے وہ اسی تحریک کی آتش آشنائی اور شعلہ سائے کا نتیجہ ہے۔ غالب کے فن اور ان کے جمالیاتی اقدار میں نشاط و رنگ اور طریر و بہک کی جو پانڈنی سی مسکتی ہے، اس کو بھی باواسطہ طور پر جو کشش اور دوسے کی اس فضا ہی نے پیدا کیا ہے جو ان نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکوں کے باعث وجود میں آئی تھی۔

غالب کے ادبی ماحول نے بھی ان کے فن اور جمالیاتی اقدار کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اردو غزل میں غالب سے قبل میر کی قلم کی ہولی روایت شاید سب سے زیادہ استوار تھی۔ غالب نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ میر کی اسادی ان کے نزدیک مسلم ہے۔ وہ انہیں بڑا شاعر مانتے تھے اور ان کے خیال میں جو ان کی اسادی کو تسلیم نہیں کرتا وہ خود بے بہرہ ہے۔

میر کے ہمیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
نہ ہے بہرہ ہے جو مستحق میر نہیں

لیکن میری مدایت کے اثرات غالب کے فی فی ۔ ہوتے کے برابر ہیں ۔ میر کے پہلے مروج کی بنیاد کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نقابت ہے ۔ ان کا فی جڑا ہی مستند فی ہے ۔ ملک کی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے ۔ وہ مل گئے ہے ۔ اس میں کوئی تکیہ نہ رہی اور نہ وہ تر کینیت نہیں ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک ایسے دور کی پیداوار ہے جس میں خود کوئی بدیہی کینیت نہیں تھی ۔ زندگی کا انداز بدل گیا تھا ۔ سوائے زمانہ نے اس کی صورت بجاڑوی تھی لیکن انہوں نے اس تبدیلی کو بجا نہیں تھا ۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے ۔ کیسے ہو رہا ہے ، اس کے نتائج کیا ہوں گے اور اس سے وہی بچاتے کے لئے کیا کرنا چاہئے ؟ غلطی یہی وجہ ہے کہ اس فی مدایت میں بے باکی نہیں ہے ۔ قہری اور تندی نہیں ہے ۔ ٹھنکی اور تھلاہی نہیں ہے ۔ جلدی اور بلند آہنگی نہیں ہے ۔ برخلاف اس کے ایک حجاب کی سی کینیت ہے ۔ ایک بہتر مدی ہے اور ایک شدید الیر رنگ اور تیز آہنگ ہے ۔ غالب نے اس مدایت سے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا ہے ۔

ابتر میر کی مدایت سے ہی ہوئی ایک اور مدایت شعور و خیال میں ایسی ہے جس کے اثرات کی جھلک کہیں کہیں غالب کے فی میں نظر آتی ہے ۔ یہ مدایت شمس ، بختا اور جرأت کی حکم کی ہوئی مدایت ہے ۔ اس میں قہر زیادہ ٹھنکی اور تھلاہی کا احساس ہوتا ہے ۔ جبکہ حوصلہ مند ہے اور دور آئینہ نظر آتی ہے ۔ ایک قہار رنگ و آہنگ

ہے کہ اس کے اثرات ان کے فن پر کیا ہوئے ؟ ان کے فن میں وہ جو ایک برتری کا احساس ملتا ہے اس کا منبع یہی ہے۔ غالب کے فن میں نقدی نہیں ہے۔ وہ غزل میں بھی اپنے آپ کو پائل نہیں کرتے۔ خوب سے خوب تر کی کوشش فنی اعتبار سے بھی ان کے یہیں جاری رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں گوی اور دوستی دونوں کا احساس ہوتا ہے اور ساتھ ہی قسمت پسندی بھی نظر آتی ہے۔ لکھنا بھی اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ اور یہ سب ان کی فنی خصوصیت ہیں جو ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں بھی اپنا جلو دکھاتی ہیں۔

سوئی کی طرح غالب کی جوانی ہمدردی طرح دیوانی نہیں تھی۔ ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کرنا اور جس پر مڑنا اس کو ہمارا لکھنا۔ جس کا ذکر غالب نے اپنے خلود میں جگہ جگہ کیا ہے۔ اس کی اہمیت یہی کہ زیادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی چھاپ بھی ان کے فن میں ایسی کچھ زیادہ نمایاں نظر نہیں آتی۔ اس سے کہیں زیادہ اثر تو اس کھنڈ سے ہوتا ہے کہ ان کے فن میں دکھائی دیتا ہے جو بچپن میں ان کے مزاج کا بڑا ہی گہرا تھا۔ غالب کے فن میں اس کے اثرات روایت شکنی، بے جا قیود سے کوٹھوسی، ایک طرح کے احساس آزادی اور کہیں کہیں سنجیدگی اور ثبات سے افزون کی منت میں ملتا ہے۔ غالب روایت کے پابند تھے لیکن اپنے فن میں انہوں نے عملی طور پر روایت کے بہت سے بہتوں کو توڑا ہے۔ ان کے فن میں شروع سے آخر تک بے باکی سے بات کہنے اور کسی کی پروا نہ کرنے

کا جو۔ تھان ہے۔ اس کا بچہ وہی احساس آزادی ہے جو بچپن میں
 بے راہ روی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کی شخصیت کا
 لازمی جز بن گیا تھا۔ ان کے فن میں جگہ جگہ احساس مزاح کا جو
 میلان غما ہے اور ظرافت کی جو بھیاں سی کو مذاق نظر آتی ہیں، اس
 کے پیچھے بھی ان کے بچپن کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جب سنجیدگی
 اور ثقافت کی طرف ان کی توجہ نسبتاً کم ہو گئی تھی۔

زندگی کا قانون ہے کہ رومانیت اور رومان پسندی ایسے
 لوگوں کا مقتدر بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی ان منزموں سے
 گذر کر خیالات کی دنیا میں بسا بیٹھتے ہیں اور تخیل کے سہارے
 بچنے کا سامان کرتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ زندگی سے جو تعلق
 وہ کرتے ہیں وہ پڑے نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ تخیل کے سہارے
 ان کی طرف پکٹتے ہیں اور پھر یہی ان کا شمار بن جاتا ہے۔ غالب کو
 بھی یہی صورت حال پیش آئی ہے۔ جس وصف سے انہوں نے
 زندگی کو بسر کیا ہے۔ اس نے ان کے مزاج میں رومانیت اور
 رومان پسندی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اس کے اثرات ان کے فن میں
 بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں جو بلند پروازی، بلند آہنگی،
 رنگینی اور رنگین کاری ہے وہ اسی رومانیت اور رومان پسندی کا
 نتیجہ ہے۔ اسی کے سہارے وہ اپنے فن میں بھی دوائی خیال کو
 اس طرح مستان طے کرتے ہیں کہ باز نشست کا مدعا تک ان کے
 یہاں باقی نہیں رہتا۔

مستانہ کر دیں ہوں رو و لوی خیال
کا باز گشت سے نہ رہے حساب

رومانی فن کار تخیل کے رنگوں سے حسین دنیا میں بناتا ہے اور اسے اپنی شاییت پسندی سے سہاتا ہے۔ لیکن اس کی یہ شاییت پسندی اسے ایسے چکر کے بھی لگاتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر ہولناک ہو کر زندگی سے بیزار ہونے لگتا ہے اور اس زندگی کی ہر چیز اسے بے اساس نظر آنے لگتی ہے۔ اس صورت حال کا رد عمل اس کے یہاں غم پسندی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے فن میں ایک کنک کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنا غم، انسان اور انسانیت کا غم، زمانے کا غم، سب مل کر اس کے فن میں ایک گداز کی کیفیت کو ابھارتے ہیں۔ غاب کے فن میں بھی گداز کا یہ رنگ اوجہ اپنے نشاۃِ آبنگ کے خاصا گہرا نظر آتا ہے۔

ایک ایسا فن کار جو اس منزل پر پہنچ جائے۔ اس کے یہاں فکری عنصر کا نمایاں ہونا لازمی ہے۔ اس فکری عنصر سے اس کے یہاں بنیدگی، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ غاب کے یہاں بھی یہ فکری عنصر نمایاں ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے فن میں بھی بنیدگی اور گہرائی کے وہ عناصر رونما ہوتے ہیں جن کے بارے میں شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ وہ ان کے فن کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ غاب فکری پہلوؤں کے اظہار و ابلاغ میں نہ جانے کہاں کہاں پہنچتے ہیں اور نہ جانے کتنے نئے آسمانوں پر پرواز کرتے

ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاتھوں ان گنت نئے پسکوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ ان گنت نئی علامتیں وجود میں آتی ہیں۔ ایک عین سا ابہام صحت اختیار کرتا ہے اور ایک نہایت ہی عین و مزیت اور ایسا نیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بنیہ نظری پہلوؤں کی دستوں کا ایک ایسی صنف میں سما جائے گا عرف حدود ہونا نہیں اور محال ہے۔

غالب نے فارسی شاعری کی روایت کے سائے میں آنکھ کھولی اور اسی روایت کے سائے میں ان کا ذہنی نشوونما ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے اہم شاعروں کے اثرات ان کے فن پر بڑے گہرے نظر آتے ہیں۔ مثلاً بیدل حنفی، غوثی، نظیری وغیرہ کے اثرات کی چھاپ ان کے فن میں جگہ جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ بیدل کی مشکل پسندی اور گرائی، غوثی کی بند خیالی اور رنگین، نظیری کی پرکاری، غوثی کی بے شمار رنگوں نے بل کر غالب کے فن کو ایک اچھی خامی قوس قزح بنا دیا ہے۔

عزمن یہ تہذیب، معاشرتی، ادبی اور فکری عوامل اور حرکات تھے جن کے ہاتھوں غالب کے فن کی عمارت تعمیر ہوئی اور جس میں اس تمام پہلوؤں کے اثرات نے اپنے حسین امتزاج سے کچھ ایسی شان و شکوہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے جو عام حالات میں ذرا مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

غالب اس اعتبار سے جہاں تک ان کی نوکری کا تعلق ہے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

وضع اور فی مہم آملگی

ہیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے غالب کا اظہار و
 ابلاغ اپنے موضوع اور مواد کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔
 ان کا فن خیال کا اور خیال فن کا پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں
 کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ہم ان کو خانوں
 میں نہیں بانٹ سکتے۔ غالب نے تو ان دونوں میں ایسی مناسبت اور
 ہم آہنگی پیدا کی ہے کہ وہ آپس میں پوری طرح خیر و شر مسلم ہو جاتے
 ہیں۔

غالب کی شاعری میں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ خیال کی بڑی
 وسعتیں ہیں۔ وہ مواد کے اعتبار سے بڑی بھر پور شاعری ہے۔
 زندگی اس پر حاوی ہے اور وہ خود زندگی پر حاوی ہے۔ اس میں
 محسن ہے، محسن پرستی ہے، عشق ہے، عاشق ہے، انسان ہے، انسانیت

ہے ، انسان دوستی ہے ، انسانیت پرستی ہے ، سیاست ہے ، معاشرت ہے ، تہذیب ہے ، ثقافت ہے ۔ غرض اس میں کم و بیش وہ ہر چیز ہے جو زندگی میں ہے یا ہو سکتی ہے اور اگر نہیں ہو سکتی تو پھر اس کی جگہ کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہونا چاہئے ۔ غاب نے ان سب کی تفسیر کی ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل پیش کی ہے ۔ اور اس طرح اپنے متنوع تجربات کو ظاہر کیا ہے کہ خود ان کے فن میں بھی تنوع کی خصوصیت پیدا ہو گئی ہے ۔ چنانچہ ان کے یہاں یکسانی اور یک رنگی نہیں ملتی ۔ برخلاف اس کے ایک رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے ۔

حسن اور حسن پرستی غاب کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے ۔ انہوں نے اس حسن اور حسن پرستی کو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت دی ہے ۔ ان کے یہاں اس کا ایک مکمل نظام ملتا ہے ۔ انہوں نے اس کا رشتہ عشق و عاشق سے بھی جوڑا ہے اور انسانی زندگی کے اس اہم پہلو کی بھی حقیقت سے بڑی بھرپور ترجمانی کی ہے ۔ ان کی شاعری میں ان موضوعات کا پتہ اچھا خاصا بھاری ہے ۔ بقول عید احمد خان :-

” غاب کے اردو اور فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے ۔ تہذیب کے لحاظ سے پورے کلام میں اس مضمون کے اشعار آدمی سے نہیں مگر ایک تہائی کے قریب مزدور ہوں گے ۔ ان اشعار میں وہی تنوع جدت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے جو دیوان اور کلیات کے دوسرے مضامین کا اختیار خاص ہے ۔ اگر

مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی ایک حقہ چھوڑ جاتے
 تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں ہوتا۔ ان
 اشار میں محض رنگا رنگ طبعات کے بند دروازے
 ہی نہیں کھلتے۔ ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا
 انکشاف ہے۔ اس دنیا کی آب و ہوا ہر طبیعت کو
 سازگار نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے لیکن اس کی
 وسعت اور بے پناہی کا یہ عالم ہے کہ ہر موقع کی ضابطت
 سے دلکش مناظر بہ کثرت ملتے ہیں۔ انسانی فطرت کے
 تمام حدود پہلو بندہ عشق کے ماتحت ہیں جس طرح خود بخود
 گزرتے، چمکتے اور ڈھلتے ہیں۔ اس کی ترجمانی میں شاعر
 نے اپنا تمام جوش و خروش جھیل اور پورا ذوقِ قلم صرف کیا ہے۔
 (غالب کی شاعری میں حسن و عشق - فقیر غالب)

غالب کی شاعری میں حسن کا بیان صرف خارجی ظاہر ہی سے
 نہیں ہوا ہے۔ اس میں تو مشاہدہ اور محسوسات دونوں کے اثرات
 نظر آتے ہیں اور پھر ان کا فکر و شعور بھی اس میں شامل ہو جاتا
 ہے۔ چنانچہ ان کے فن میں ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جب حسن کے
 بیان میں حقائق کی تلاش و جستجو شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر
 حسن صرف حسن انسانی تک محدود نہیں رہتا۔ کائنات کا حسن بھی انہیں
 اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ منظر فطرت کو حیرت سے دیکھتے
 ہیں اور اس طرح تفسیلاتِ خیال کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرتے
 ہیں۔ اور ان کی فکر عشق حقیقی تک رسائی حاصل کر کے ایک تفسیلات

انداز و اسلوب کو ان کے فن میں نمایاں کر دیتی ہے لیکن یہاں بھی ان کے اظہار و ابلاغ کی طرح داری اور پاکیزگی کو ششیں نہیں گنتی۔ حسنِ حسن کے حقیقت اور تنوع پہلوؤں کے بیان میں بھی غالب نے اگرچہ اسلوب کے تنوع اور رنگا رنگی کو باقی رکھا ہے۔ لیکن اس میں ہر جگہ ان کی جمال آفرینی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ حسن، احسن پرستی یا محبوب کے حسن اور حسنِ عمل کے موضوعات پر یہ اشعار ان کی اس جمال آفرینی کے بہترین نمونے ہیں۔

رنگِ شکستہ بچ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتگی لگاتار کا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کو دیکھا ہی نہیں
دُش سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ غلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بھلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے ترکیب
بات کرتے کہیں ب تشوہِ تقریر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قند یار کا عالم
میں معتقد تھا شہر نہ ہوا تھا

آئینہ دیکھ اپنا سامنے سے کہ رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور مت

فکر اس پری دُش کا اور پھر بیانی اپنا
بہ گیا رقیب آخر تھا جو راز دان اپنا

مڑتا ہوں اس آواز پر ہر چند سراؤں جائے
جلد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

تو اور آرائشِ خرم کا کل
میں اور اندیشہ مائے دور و دراز

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیابانِ خیابانِ ارم دیکھتے ہیں

ترے سرِ وقامت سے اک قدر آدم
قیامت کے حقے کو کم دیکھتے ہیں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
جہاں شکی پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لوگوں کا ایک چسپاں نا بچاؤ کا
لوگوں کا ایک بگڑا عتاب میں

شرم کی اداوائے آواز ہے اپنے ہی سے سہی
میں کہتے بے جواب کہ ہیں یوں سبب میں

آرائشِ جلال سے تلخ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

نظر تھے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں سرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اس سادگی پہ کون نہ مڑ جائے اسے سدا
رہتے ہیں اور اٹھتے ہیں تھوڑے بھی نہیں

یہ کس بہشتِ خفا کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گلِ مہ گذر میں خاک نہیں

جب وہ جاہلِ دل فروز صورتِ مہر نیم روز
آپ ہی ہر لحاظ سے سوز پرشور میں مڑ چھائے کیوں

دشمن غمزدہ جاں ناک آواز بے پناہ
 تیرا ہی عکس رخ سحر سامنے تیرے آئے کیوں

پرسش مرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کسے
 اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کیوں

غمنہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کیوں
 بوسے کو پوچھتا ہوں میں مرنے بھرتا کیوں

آجئے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
 ہو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

چشمِ غرباں غامضی میں بھی فواہ پرواز ہے
 سرور و سکون کے دود شعلہ آواز ہے

ہو کے عاشق وہ چری دو اور نازک بن گیا
 رنگ کھتا جائے ہے جتنا کہ آڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مسعود پر بھی کیا کیا ناز ہیں
 کھینچتا ہے جس قد آشنا ہی کھینچتا جائے ہے

سادگی پر اس کے مُرجانے کی حسرتِ دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجرِ کُتِ ستاق میں ہے

نفاذ سے بھی کام کیا واں نفتاب کا
مُنتی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقشبِ پا
موجِ خسراں یار بھی کیا لگن کتر گئی

دل ہوا تے خرامِ ناز سے پھر
مشرستانِ بے تساری ہے

دُشیلے میں یہ کرشمہ برق میں یہ ادا
کوئی تباؤ کہ وہ شوقِ تند خو کیا ہے

چپک رہا ہے دل پر لہو سے پسند اہیں
بہلی جیب کو اب حاجتِ رونگیا ہے

مُرجو یا بکلا ہو جو کچھ ہو
لاش کو تم میرے لئے ہوتے

بارنِ گلِ دیکھ روئے یارِ یاد آیا اسد
چرخِ فصلِ بہاری اشتیاقِ انگیز ہے

مئے نہ دکھلا مئے نہ دکھلا، پر یہ اندازِ عتاب
کھل کر پروہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

وہ میسر ہوئی پرول میں جب اُتر جاوے
نگاہِ تاز کو پھر کیوں نہ آشنا کہتے

نہیں نگار کو آفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روشنی و مستی ادا کہتے !

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طاقتِ چمن و سخن ادا کہتے !

چاہے ہے پھر کسی کو مفت بل میں آندو
مرے سے تیز دشتِ مرزا گان کئے ہوئے

اک نہ بہارِ تاز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چموز و بخت سے لکھتاں کئے ہوئے

لگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
نرسے سے تیز دشتہ مرگن کئے ہوتے

یہ پڑی چسہ۔ لوگ کیسے ہیں
غزۂ د عشوۂ ادا کیا ہے

شکر زلف منبر میں کیوں ہے
نجم چشم سُرر سا کیا ہے

میں طویل انتخاب یہاں کر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ سنی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کے لئے جو زاویے غائب نے ان اشعار میں تلاش کئے ہیں اس کی پوری طرح وضاحت ہو اور ان سے صحیح طور پر آشنا ہونے کا موقع ملے۔ ان اشعار کی بنیاد صرف مشاہدہ نہیں ہے بلکہ محسوسات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں خارجیت کا رنگ نظر نہیں آتا۔ برعکس اس کے داخلیت کا رنگ ان میں خاصا گہرا نظر آتا ہے۔ یہ سنی سے زیادہ سنی کے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حواس کے ارتعاش کی پیداوار ہیں۔ اس لئے حواس میں ارتعاش پیدا بھی کرتے ہیں۔ ان کی جڑیں احساس اور جذبے کی زمین میں بڑی گہری ہیں۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک ایک ہر گہر تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ ان میں بیانیہ انداز نہیں ہے۔ بلکہ پہلو وار طرزِ اظہار ہے۔ اور اسی پہلو وار طرزِ اظہار میں اس

جمال آفرینی کا راز ہے جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔

ان اشعار کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ لیکن ان کا محور حُسن ہے اور وہ اسی حُسن کے گرد گھومتے ہیں۔ غالب نے ان اشعار میں حُسن کے جن پہلوؤں کا یا جن پہلوؤں کے حُسن کا ذکر کیا ہے وہ بھی نئے ہیں اور جن انداز میں ان کا ذکر کیا ہے ان میں بھی ایک نیا پن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں سے ہر ایک میں جدت اور ا کی خصوصیت کئی نہ کسی زاویے سے اپنا جلوہ مزور دکھاتی ہے اور ان کے حُسن و جمال کا راز اس جدت اور میں بھی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی کہ حُسن کے بیان میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جب غالب کا ذوقِ جمال احساسِ مزاج کے ساتھ مل کر ان اشعار میں مجرئی طور پر ایک نہایت ہی حُسنِ فغا کا تم کر دیتا ہے اور یہ فغا غالب کے فن کی جہان ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے فکری میلان اور فلسفیانہ رنگہاں نے سیرت کی جو فغان میں سے بعض اشعار میں پیدا کر دی ہے وہ بھی احساسِ جمال کی تکیوں کا باعث بنتی ہے۔ غرض حُسن اور حُسن پرستی کے موضوع نے غالب کے فن میں بڑے پہلو پیدا کئے ہیں اور ہایاتی اعتبار سے اس کو حد درجہ دلآویز اور دل نشین بنا دیا ہے۔

غالب نے حُسن اور حُسن پرستی کے موضوع پر جن اشعار کی تخلیق کی ہے، ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ حُسن کے بارے میں بعض سطحی باتوں کی ترجمانی نہیں کرتے۔ بلکہ انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت اس نئے جناتی تقاضوں، اس کی خواہشوں اور آرزوؤں اور اس کے فکری و شعور کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں

حسن کا بیان ، انسانی نفسیات اور انسان اور انسانی زندگی کے درمیان
یا بھی رشتوں اور روابط کا بیان بن جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ بعض
ایسے مسائل و مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں جن میں بہ ذاتِ خود بھی حسن
ہوتا ہے لیکن غالب اس سلسلے میں حالات و واقعات کی جو صورتیں پیدا
کرتے ہیں ، وہ ان کو کچھ زیادہ ہی حسین بنا دیتی ہیں ۔

یہ صورت حال یوں تو ان کے ایسے اشار میں بھی نمایاں ہے جن
کا موضوع حسن اور حسن پرستی ہے لیکن اس کی بہترین مثالیں ان اشار
میں نسبتاً زیادہ ملتی ہیں جن میں حسن سے زیادہ عشق و عاشقی کے مختلف
اور متنوع پہلوؤں کا بیان ہے ۔ عشق و عاشقی کے بیان میں غالب نے
پوری زندگی کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ
ان کی عشقیہ شاعری میں جن مضامین کا بیان ملتا ہے ، ان میں بڑا
تنوع ہے ۔ وہ کہیں عشق و عاشقی کے جگہ جگہ پہلوؤں کی ترجمانی
کرتے ہیں ۔ کہیں عرفات اور مزاج کے پیرے میں اس جذبے کے مختلف
پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ کہیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس جذبے
کی ولادت و کیفیات کو پیش کرتے ہیں ۔ کہیں حد درجہ رنگینی اور رعنائی
کے ساتھ اس کے مختلف مسائل کی تصویریں بناتے ہیں ۔ کہیں حد
درجہ گہرائی کے ساتھ اس کے پیچیدہ مسائل کو سلجھاتے ہیں ۔ کہیں نہایت
بے باکی کے ساتھ اس جذبے کے بعض حقائق کو بیان کرتے ہیں اور کہیں
بڑی ہر گیری کے ساتھ اس جذبے کی مابہت کا سرخ نگاہتے ہیں اور
اس کی نفسیاتی تحلیل کرتے ہیں ۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان
تمام مختلف بلکہ متضاد پہلوؤں کی ترجمانی میں جاپاتی اظہار کی نئی نئی

صورتیں پیدا کی ہیں۔

مثلاً کے طور پر عشق و عاشقی کے سونوچ پر غائب کی شاعری

میں اس قسم کے اشارے بھی ملتے ہیں۔

بُئیل کے کاروبار پر ہیں خُذہ اسے لگی
کہتے ہیں جس کو خُش غل ہے دماغ کا

اس سادگی پر کون نہ مَر جائے اسے خُدا
لاٹے ہیں اور ہاتھ میں عمار بھی نہیں

ہمکھ کی تصویر سزا سے پہنچی ہے کہ
تجہ پہ کھل جاوے کہ اس کو خُش دیر ہے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
ساکس ہوئے تو عاشقی اہلِ کرم ہوئے

کہتے ہو ذریں گئے دل ہم نے گر پڑا پایا
دل کہاں کو گم کیجئے ہم نے مَرعا پایا

غافلِ ابنِ مرہٹوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہتے

سپاہتے ہیں خوب رویوں کو ہست
آپ کی صورت تو دیکھ چاہتے

سادہ و پُرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے یہاں دنیا باندھتے ہیں

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کرمیت ہاتھ آئے تو مال اچھبے

مگر کھڑائے کوئی اس کو خط تو ہم سے کھواتے
ہوتی بھج اور مگر سے کان پر نہ کہ کر مسلم نکلے

دہ پر رہنے کو کہا اور کہہ کے کیا چھوڑ گیا
جتنے عرصے میں مرا پٹنا ہوا بستر کھلا

دل ہی تو ہے سیاستِ دریاں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں دُور سے ترے بن صدا کئے

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں نہیں آگے
بارے آشنا نکو ان کا پاس بان اپنا

گلاب کے وہ چہرہ تھا مری جوشامت آئی
آٹھا اور آٹھ کے قدم میں نے پاہاں کے لئے

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیسرے ہتی
سکے کے ستمِ غزلین نے مجھ کو آٹھا دیا کریں

ہے کیا جو گس کے بازو سے میری بلا ڈوسے
کیا جانتا نہیں ہوں ستاری کمر کو میں

ابنِ اشار میں شوخی کا حسن ہے۔ ظرافت کا جہل ہے۔ غالب
اس انداز سے حسن و جہل کو پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اردو غزل
کی روایت میں صرف شیخ اور داغ کے ذکر کے ساتھ شوخی اور ظرافت
کا حسن و جہل پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور موضوع میں حسن کی
یہ قدر نمایاں نہیں ہوتی۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ حسن و عاشق اور
کارہ بارِ شوق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں انہوں نے بعض ایسی صورتیں
پیدا کی ہیں جن کے بیان میں حسن و جہل کا یہ انداز پیدا ہو گیا ہے۔ حسن
کو داغ کا نخل کنا، محبوب کا بغیر تلوار کے ڈونا اور عاشق کا سادگی پر
مرنا، حسرت و دیدار کو ظاہر کرنے کے لئے آنکھ کی تصویر مرنے پر کھینچنا،
گدائی میں دل لگی کو نہ چھوڑنا، دل کا محبوب سے واپس نہ لانا۔ مرغلستون
کے لئے اچھی صورت کا عاشق ہونا، بیج کو گھر سے کان پر رکھ کر قلم
نکھن، یا سب دربان سے ڈونا، عاشق کا پاسبان کے قدم لینا، محبوب کا

عاشق کو غیر بکر اٹھا دینا — یہ تمام مضامین آرد و غزل کی روایت میں نئے ہیں۔ اسی لئے غالب نے ان کو پیش کرنے میں بھی ایک نیا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ان مضامین میں شوخی ہے۔ ان کی بنیاد احساس مزاح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے ان کے ہایاتی افسار میں غزوات سے کام لیا ہے اور اس طرح وہ فنی اعتبار سے حق کاری کے ایک ایسے انداز کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو صرف انہیں کے فنی کا جوتہ ہے۔

عشق و عاشقی کے بیان میں نشاطیہ رنگ اور طریہ آہنگ بھی غالب کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کو غالب نے انسان کا ایک بنیادی جذبہ اور دو انسانوں کے درمیان ایک نیلی رشتہ قرار دیا ہے۔ اس رشتے میں بعض ایسی منزلیں بھی آتی ہیں، جب انسان کی آنکھوں کے سامنے رنگیں پردے سے پڑ جاتے ہیں اور وہ اس زندگی کے ہر پہلو اور کائنات کی ہر چیز کو رنگیں اور پرکارا شگفتہ اور شاداب دیکھتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کے حسین ترین لمحے ہوتے ہیں۔ ان لمحوں میں رنگ بکھرتے ہیں اور زندگی رنگین اور رعنائی سے بھرپور ہو جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں اس کیفیت کی ترجمانی بہت زیادہ ہے۔ اور اس کیفیت کی ترجمانی میں انہوں نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس انداز بیان میں بھی رنگین اور رعنائی کا شباب نظر آتا ہے اور شگفتگی اور شادابی اپنے مزاج کمال پر دکھائی دیتی ہے۔

یہ اشعار نہ صرف موضوع بلکہ اسلوب اور انداز بیان کے لحاظ

سے بھی کتنے رنگیں اور کس درجہ مختلف اور شاداب ہیں ۔
 تجاہل پیشگی سے مدعا کی
 کہاں تک اسے سراپا ناز کی کیا

فردشس ہائے بے جا دلچیت ہوں
 فحشائیت اسے رنگیں کا گلا کی

نکاوے بے عا با سہا ہوں
 تناظر اسے رنگیں آرزو کی

سے تو مٹ سوتے ہیں اس کے پاؤں کا پور مگر
 ایسی باتوں سے وہ کافر جگان ہو جائے گا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
 انہوں نے شوق کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ذکر اس پڑی دیش کا اور پھر بیان اپنا
 بن گیا رقیب آخرت جبرائیل دان اپنا

سے وہ کیوں بہت پیچھے ہٹے ہیں یارب
 آج ہی ہوا غفلت کو امتحان اپنا

پچھلے پچھلے جڑ کو رو تے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شرفی گفتار دوست

تو اور آرائشِ حسنم کا کل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

دھل دھپا اس سراپا تاز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غائب پیش دستی ایک دن

ہم سے کُل جاؤ بہ وقت سے پرستی ایک دن
ورنہ ہم پھیرنے لگے دھک کر مذمتی ایک دن

ہم پر جن سے ترکِ وفا کا لگاں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحان نہیں

کس مژ سے شک کیجئے اس لعلِ خاص کا
پرستش ہے اور پائے سخن در میان نہیں

پور نہیں نہ دیکھتے دُشمنام ہی ہی
آزماں تو رکھتے ہو تم گرزبان نہیں

ہاں ہے ہاتے بوسے کیوں گئے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

مشاکر اسے ہر اُٹینہ داری
تجے کس تناس سے ہم دیکھتے ہیں !

دشمنِ غمزہ جاں سناں ناکو ناز ہے پناہ
جرا ہی کھس رخ سحر سانسے تیرے آنے کیوں

غمنہ ہاشنگفر کو دور سے مُت دکھا کہ یوں !
بوسے کو پوچھا ہوں میں مڑے مجھے بنا کر یوں

پرسبش طرزِ دہری کیجئے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلتے ہیں ادا کیوں

رات کے دت سے چتے ساتھ رقیب کو لئے
اُسے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے
سانسے اُہی بیٹھا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے دو برو کیوں نہ سمجھیں بیٹھے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی دغا کر یوں

بج سے کہا جو یاد نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بے خودی پہننے لگی ہوا کر یوں

کب بچے کو تے یار میں رہنے کی دمنع یاد تھی
ایزہ دار بن گئی حیرت لقیٹش پا کر یوں

گرتے دل میں ہو خیال دھل میں شوق کا زلزل
موج مہل آب میں مارے ہے دست و پا کریں

دغا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوٹنا پھڑا
تو پھر اسے نکل دل تیرا ہی سنگہ تان کیوں ہو

یاد سے چھیڑ چل جائے اسد
گر نہیں وصل تو سرت ہی سہی

اس بزم میں بے نین بنتی حیا کیے
بیٹھا سا اگر سہہ اشد سے ہوا سکے

سادگی پر اس کی مرنے کی حسرت دل میں ہے
 میں نہیں چتا کہ پھر غنیمتِ حق میں ہے

پھر کچھ اک دل کو بیتِ رسی ہے
 سینہ جو دیتے زخمِ کاری ہے

پھر بگڑ کھونے لگا ناخن
 آمدِ قسبل لارِ کاری ہے !

دل بوائے خوامِ ناز سے پھر
 عشقِ ستانِ یہ قسری ہے

سے نے کیا ہے تھن خود آرا کو بے حجاب
 اسے شوقِ یوں اجازتِ تسکیم و ہوش ہے

کبھی نیکی بھی اس کے بی میں گر جائے ہے بھرت
 جہانیں کر کے اپنی یادِ شرما جائے ہے بھرت

وہ بدخوا اور میری داستانیِ عشقِ طوفانی
 عبادتِ محقرِ قاصد بھی کبھر جاتے ہے بھرت

اوجر وہ بدگمانی ہے اوجر وہ ناتوانی ہے
 نہ بچا جاتے ہے مجھ سے نہ بولا جاتے ہے مجھ سے

ابن اشعار میں انسان کی لطیف ترین کیفیات کا بیان رنگین ترین پیرائے
 میں ہوا ہے۔ غالب نے ان میں نوادش اُسے بے جا، شکایت اُسے
 رنگین، نگاہ بے محابا، کھانے اُسے ٹیکیں آزما، شوخی گفتار دوست،
 آرائش خیم لاکل، اندیشہ اُسے دور و دراز، تھڑستی، لطف خاص
 پھانے بوسہ، سر آئینہ داری، دشت غمزہ، نادر کا ناز، غنچہ ناشگفتہ،
 پرشش طرزِ دہری، سیرت نقشب پا، آمدِ فعلِ لار لاری، مشرستان
 بیقراری، اجازتِ تسلیم و ہر شش، حق خود آرا کی بے محابی کی حسین اور
 پرکار ترکیبوں میں کاروبارِ شوق کی جن منزلوں کی تصویریں کھینچی ہیں وہ
 ہر شے بہ ذاتِ خود بھی حسین اور دکھ دینے والی غالب کے انکار و
 ابلاغ کی رنگینی اور پرکاری نے ان کو کچھ اور بھی رنگیں اور پرکار بنا
 دیا ہے لیکن ان میں صرف الفاظ اور ترکیبوں کا حسن ہی نہیں ہے جو
 غالب کے اس قسم کے اشعار کو جاہلیاتی انداز سے مالا مال کرتا ہے۔
 بلکہ مجموعی طور پر جاہلیاتی انداز کی وہ فضا ہے جو غالب کے ایسے بچے ہوتے
 ذائق کے شاعر ہی کی شاعری میں پیدا ہو سکتی ہے۔ ان اشعار میں سے
 بیشتر میں کاروبارِ شوق کے مختلف مساعلات کی ترجمانی ہے لیکن جہاں
 ملک انکار کا تعلق ہے کسی ایک شعر میں بھی وہ فضا پیدا نہیں ہوتی
 جو مسامحہ بند شاعروں کی شاعری میں عام طور پر نظر آتی ہے۔ غالب
 کے ذائق میں اتنی تہذیب اور شائستگی ہے کہ وہ کاروبارِ شوق کے

ان لمحوں کی ترجمانی میں بھی اپنے حدود سے باہر نہیں نکلتے بلکہ جیسا کہ ان اشارے سے ظاہر ہے وہ ان لمحات کی ترجمانی میں کچھ زیادہ ہی لطافت اور نفاست کا اتہام کرتے ہیں۔ لیکن یہ اتہام شعوری نہیں ہوتا۔ یہ تو ان کا مزاج ہے چنانچہ اس گہذب اور لطافت پسند مزاج ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ ان سماعت کی ترجمانی میں جمالیاتی اظہار کی لطافت اور نفاست کو باقی رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اس قسم کے اشارے میں یہ جمالیاتی اظہار اپنی انتہائی جہدوں پر نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جمالیاتی اظہار کا یہ انداز غالب کی شاعری اور خاص طور پر ان کے فن کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف ان کی شاعری میں بلکہ اردو شاعری کی روایت میں ایک رنگینی اور شادابی نظر آتی ہے اور اس کے اثرات غالب کے بعد آنے والے شاعروں کے یہاں بھی کسی نہ کسی صورت میں فروزے ہوئے ہیں۔ لیکن غالب کا اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس رنگین اور چرکار، گفتگو و شاداب جمالیاتی اظہار کے ساتھ ساتھ جمالیاتی اظہار کا وہ انداز بھی پیدا کیا ہے جس کو دل پر لگی ہوئی چوٹ ہی پیدا کر سکتی ہے۔ اس جمالیاتی اظہار کی بنیاد ایک قسم کا گداز ہے جو احساس عروسی کے استخوان پیدا ہوتا ہے۔ اس کی اساس ایک قسم کی کسک ہے جو حسرت، دنا کاری، ناامیدی، بے اختیاری اور بھوری کے استخوان وجود میں آتی ہے۔ غالب کی شخصیت میں احساس نشاط اور احساس طرب کے ساتھ احساس عروسی و دنا کاری بھی ملا ہوا تھا اور اس احساس عروسی و دنا کاری نے ان کے یہاں کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لی تھی۔ سبب اس کا یہ ہے

مگر غالب طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے رومانی تھے۔ رومانی کے یہاں یہ دونوں احساسات شدید ہوتے ہیں کیونکہ احساس نشاط کی شدت اس کے یہاں احساس غریبی کو شدید سے شدید تر کرتی رہتی ہے۔ اسی لئے رومانی مزاج شغفس میث و نشاط سے بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کے احساس کی شدت اور تھین کی بلند پروازی اس کو نشاط و طرب کے طوں میں بھی یہ احساس دلاتی رہتی ہے کہ یہ لمحے بھی باقی رہنے والے نہیں کیونکہ انسان کا مقصد یہ ہے کہ اس کا قلب ہمیشہ نگار ابد اس کی چشم ہمیشہ خون نشان رہے۔

غالب نے ایک رومانی کی حیثیت سے اس حقیقت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا شاعر جو عشق کے رشتے کو صرف خواہش قرار دیتا ہو اور محبوب کی پرستش کو ساقی پر حمل کرتا ہو، جو عاشق ہونے کے باوجود اپنی مشوق فریبی کا ڈھنڈورہ پیٹتا ہو، اور جو عشق کو صغن دماغ کا غفل جانتا ہو،^{۱۳} وہ جب عشق کی واردات و کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے تو اس کے کلام میں ایک گداز اور کسک کی سی

وہ خواہش کو احمقوں نے پرستش و اقرار

کیا پوچھا ہوں اس بیت بیدارگر کو میں

۱۳، عاشق ہوں پر مشوق فریبی ہے مرا کام

جنوں کو بُرا کہتی ہے بیٹا مرے آگے

۱۴، جیل کے کاروبار پر ہیں خندہ اسے گل

کہتے ہیں جس کو عشق غفل ہے دماغ کا

کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ گداز دلوں کو تڑپاتا ہے اور یہ کک احساس
 غم کی ایک لہر کو بیدار کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی وجہ سے بیزاری
 کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ غالب نے عشق و عاشقی کے انفعالی پہلوؤں
 کی ترجمانی بھی کی ہے۔ واردات و کیفیات کی مصدسی میں بھی وہ پیش پیش
 رہے ہیں۔ انہوں نے غم کا بیان بھی کیا ہے لیکن ایسے مواقع پر ان
 کے اظہار و ابلاغ میں انفعالییت کا رنگ نمایاں نہیں ہوتا اور یاسیت کی
 تاریکی بھی اپنے پر نہیں پھیلاتی بلکہ جب ان کا فن زندگی کی ان منزلوں
 سے گزرتا ہے تو وہ اس کی بنیاد اصیت پر استوار کر کے اس میں ایسا
 آفاقی رنگ بھرتے ہیں کہ اس کی تندی بھر جاتی ہے اور وہ غم انسان
 اور انسانیت کے لئے گویا ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت اس کے لئے لذت
 اور آسودگی کا باعث بن جاتی ہے۔ غالب کے فن میں جمالیاتی
 اظہار کی وہ آن بان اور شان پیدا ہوتی ہے جو مرنے والی کا جھٹکا
 ہے۔

میر اشعار اس کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

عشق سے طبیعت نے زینت کا مرہ پایا
 درد کی دوا پائی درد ہے دوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
 آگ اس گھر کو گی ایسی کہ جوت کھل گیا

ہوئے گل ناز دل دو دو چہرہ رخ منظر جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

دل تا جگر کا ساحل دریائے خون ہے اب
اس رہگذر میں جلوہ گل آگے گرد مت

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و دنا سے چھوڑوں
وہ منکر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا ،

کس سے عروسی بہت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اب میں ہوں اور ماتم یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ شمال وار تھا

غمِ زان میں تکلیف سیر گلِ مت دو
جے داغ نہیں خندہ اسے بے جا کا

میں اور بزمِ سے یوں تشرِ کام آؤں
گر میں نے کی تھی تو برساتی کو کیا ہوا ستا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کنا کیوں ہوتا تو کیا ہوتا

تم سے ہے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا لگو
اس میں کچھ شائبہ غریب تقدیر بھی محبت

دردِ دل کھوں کیونکر جاؤں ان کو دکھاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامِ خوں چکاں اپنا

چکے چکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخی گفتارِ دوست

اُٹے جے جے کسی عشق پر رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بس

عاشقِ بسِ طلب اور متنا ہے تاب
دل کا کیا رنگ کوں خونِ سبک ہونے تک

میں اور مد ہزار فوائے سبکِ خواہش
تو اور ایک وہ نہ شنیدنی کہ کب کہوں

متاثر کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تناس سے ہم دیکھتے ہیں ا

راہِ مشوق نہ رسوا ہو مہربانے
ورنہ مرنے میں کچھ بھید نہیں

رہے اُس شوق سے آرزو ہم چندے تکلف سے
تکلف بے طرہ تھا ایک اندازِ جنون وہ بھی

مجھ سے مت کہ تو میں کتا مت اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
دھجکا جائے ہے مجھ سے زعفرانِ جانے ہے کچھ سے

ان اشعار میں عموماً طور پر جو پہلو نمایاں ہیں، ان میں اصیت، سادگی اور جدت کے عناصر سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ غالب نے یہاں حوالت بھی کہی ہے، جن کیفیت کا اظہار بھی کیا ہے، اس میں اظہار کا کوئی نیا پہلو ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ غالب کے ان اشعار میں سنجیدگی ہے ورنہ ہے، گداز ہے، کہیں کہیں ان میں ایک کسک کی سی کیفیت بھی ملتی ہے لیکن ان سب کا اظہار ایک پہلو دار انداز میں ہوا ہے اور اسی انداز نے ان کے جمالیاتی اظہار میں جان ڈال دی ہے۔ غالب اس اعتبار سے بہت بڑے فن کار ہیں۔ معمولی واردات و کیفیات میں پہلو پیدا کر کے اس کو زمرن اہم بلکہ دل کش بنادینا ان کے فنِ کمال پر دلالت

کرتا ہے ۔

جایاتی اظہار کی یہ پہلو دار کیفیت غالب کی شاعری کے اس حصے میں
 یکہ اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے جس میں انہوں نے معاشرتی حالات اور
 حیات و کائنات کے مسائل و مسائل کی ترجمانی کی ہے ۔ اس منزل پر
 پسپوگر غالب زیادہ تر داری کے ساتھ اظہار کرتے ہیں اور اس اظہار
 کو زیادہ پہلو دار بناتے ہیں ۔ کیونکہ ان کا موضوع اس بات کا تعارض کرتا
 ہے ۔ اپنے زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی حالات کی ترجمانی اور حیات و
 کائنات کے بنیادی مسائل و مسائل کی عکاسی کی بنیاد ان کا فکر و شعور
 ہے ۔ اسی فکر و شعور کے سہارے انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے
 اسرار و رموز کھولے ہیں اور ان کی نفسیاد تحلیل کر کے آج بھی ہر قاری کو
 سلجھایا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ان کے فن میں ایسے مواقع پر زیادہ
 گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور زیادہ وسعتیں نظر آتی ہیں ۔ جایاتی اظہار
 کی اس منزل میں وہ گہری جنیدگی کو اپنا رہنا جانتے ہیں اور پھر اشاعتوں
 اور کنایوں کے سہارے آگے بڑھتے ہیں ۔ رمزیت اور ایمائیت کا ہمارا
 لپٹے ہیں ۔ لطیف ابہام کا دامن پکڑتے ہیں ۔ ان تمام باتوں سے ان کے
 فن میں اسیت اور واقعیت ، گہرائی اور گیرائی ، دست اور ہر گہری کی
 خصوصیات پیدا ہوتی ہیں ۔

غالب کی شاعری کا یہ جذبہ فن اور جایاتی اعتبار سے بڑی اہمیت
 رکھتا ہے کیونکہ اسی مقام پر پسپوگر وہ جایاتی اظہار کے نئے سانچے بناتے
 ہیں اور نئے زاویوں سے اظہار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ احساس جمال کی
 تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں ۔

میںم اشہد ان کے فن کی جان ہیں اور ان کے آنچن میں ان کا یہ
 فنی رحمان اپنی پڑی آب و تاب کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے ۔

نقش فریادی ہے کس کی شرقی تزییر کا
 کاغذی ہے پیر ہی ہر ہیکر تصویر کا

فنیہ پیر کا کھنکھنے آج ہم نے اپنا دل
 خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا !

دل میں ذوق وصل و یارِ یار تک باقی نہیں
 آگ اس گھر کو گل ایسی کہ جڑ خا سبیل گئی

دل سا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
 اس دگدز میں جلوہ گل آگے گرد و نقاب

مری قیصر میں مغرب ہے اک صدمت خواب کی
 ہیولا برقِ خوں کا ہے خونِ گرم دہقان کا

نظر میں ہے ہماری جادہ راہ فنا خائب
 کو یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشان کا

بعدِ غُرف ہے ساقی مُدِ تَشَنُّدِ کامی بھی
جو تود پائے مئے ہے تو میں خیا زہ میں سال کا

عزم نہیں ہے تو ہی تو اُسے راز کا
یاں ورنہ جو کجاب ہے پردہ ہے ساز کا

نمازِ کاوشِ علمِ بحرِاں ہوا اسد
سینہ کو سقا دینے لگا اُسے راز کا

نہ تھا کہ تو نہ تھا کہ نہ ہوتا تو نہ ہوتا
ڈوبا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غافل ہو ہم نمازِ خود اُرا ہے ورنہ یاں
بے شادِ مہمانیں طسہ گیاہ کا

عشرتِ قلہ ہے دریا میں فنا ہو گیا
درد کا حد سے گزرتا ہے دوا ہو گیا

بچنے بے جلوہ گلِ ذوقِ ناشامِ آب
چشم کو چاہئے ہر دم میں دا ہو گیا

نثار باندھ سبتہ صد دانہ توڑ ڈال
دبر و چلے ہے راہ کو سہوار دیکھ کر

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی سسکت کی آواز

یک نظر بیش نہیں فرمت ہستی منِ قل
گر مئی بزم ہے اک رقصِ شر ہونے تک

دلق ہستی ہے عشقِ غامذ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برقِ غم میں نہیں

سب کہاں کچھ لادوگی میں منایاں ہو گئیں
خاک میں کیا سوتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ہے آدمی بے بس نے خود اک مشرِ خیال
ہم انجمن کجے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو!

خیالِ مرگ کب تکیں دلِ آزرہ کو پنشنے
مرے دامِ تنہا میں ہے اک صیدِ زہوں وہ بھی

سے عشق کی خواہش ساقی سگروں سے کیا کیجئے
 لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام وازگوں مدھی

مہتی کے مت فریب میں آہائید اسد
 عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

فہرہ ہاشمیتیں ابرگ عافیت معلوم
 باوجود دل میں خواب گل پریشانی ہے

پنہاں تھا دام سنت قریب آشیان کے
 اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
 وہ لوگ رفته رفته سراپا آلم ہوئے

یتری ونا سے کیا ہو مٹانی کردہر میں
 یترے سوا بھی ہم پر بہت سے قسم ہوئے

کھتے تھے جن جن کی حکایت خون چکاں
 ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہوئی ہیں سے توجہ حسنگ کی وار پاسے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ شہرہ پتہ ستم نکلتے

بکس کا سراز جلد ہے حیرت کو لے خدا
آئینہ فزاش شش جبت انتہار ہے

اسے پر تو خود شید جہاں تاب را دھر بھی
ساتے کی طرح ہم پہ جب وقت پڑا ہے

جوش جنوں سے پکڑنوتا نہیں اسد
صرا ہمارنی آنکھ میں یک مشت خاک ہے

ان اشعار کی منفیت وسیع اور ہر گیر ہے۔ ان میں کہیں انسانی
زندگی کی بے ثباتی کا شکوہ ہے کہیں اس زندگی میں انسان کی عروسی کا بیان
ہے۔ کہیں اس بے ثباتی اور عروسی پر غم کا اظہار ہے کہیں فنا کا ذکر ہے۔
کہیں انسان اور خدا کے تعلق کی وضاحت ہے۔ کہیں انسان دوستی کا درس
ہے۔ کہیں انسان کی بندی اور برتری کا خیال ہے۔ غالب نے ان موضوعات
کی ترجمانی محض فلسفیانہ انداز میں نہیں کی ہے۔ ان سب کو تجربے میں سمایا
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے موضوعات نے ان کی شاعری میں شاعرانہ
دوب اختیار کیا ہے۔ ان میں ٹھری بنیدگی کا رنگ مزہد نمایاں ہے۔ لیکن
ان گہرے موضوعات کو شریعت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کے لئے

غالب کو اشاروں اور علامتوں کا سمجھنا پڑا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے جالیاتی انہار میں رمزیت، ایمائیت اور تہ واری کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ ان کے فن کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

غرض غالب کی شاعری کے متنوع موضوعات نے ان کے فن اور جالیاتی انہار میں بھی تنوع پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جالیاتی انہار و ابلاغ بھی مختلف طریقوں سے ہوا ہے۔ اور ان کے فن میں اس انہار کے مختلف روپ ملتے ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس جالیاتی انہار کو موضوع کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ کیا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان بالور کا طرح مناسبت پیدا کی ہے اور مناسبت اور ہم آہنگی کا یہ عمل ان کا ایک اہم فن کارنامہ ہے۔

روز و آهنگ

شاعری اور شاعرانہ فن کاری کی بنیاد درحقیقت وزن و آہنگ ہے اس کے بغیر شاعری اور اس کے فن کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ شاعری کے تمام عناصر اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ وزن و آہنگ ان سب کو اس طرح ایک رشتے میں شلک کرتا ہے کہ ان میں مجموعی طور پر ایک مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ شاعرانہ فن کاری کا سب سے اہم عنصر بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت تخلیق ہوتی ہے اور وہ شاعر کے تخلیقی مزاج کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ دراصل وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں شاعر کی تخلیق رو کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کو خیال اور موضوع کا رقص و غریب کہا جائے تو بے جا نہیں۔ شاعری کا موضوع اور خیال ایک متحرک چیز ہے۔ حرکت ہی کی وجہ سے اس کا وجود ہوتا ہے اور وہ اسی حرکت کے سہارے ایک صورت اختیار

کرتا ہے۔ یہ حرکت بھی درحقیقت وہ وزن و آہنگ ہے جو مواد اور موضوع کی صفت اور بنیت کو وجود میں لاتا ہے اور مجموعی طور پر شعری تجربے کے مخصوص آہنگ کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔

غالب کی شاعری میں بھی وزن و آہنگ کی یہی صورت ہے وہ ان کے تجربات کا پابند ہے اور ان کے مخصوص جذبات و احساسات اور فکر و شعور کے ساتھ پوری طرح مناسبت رکھتا ہے اور اس میں ان کے فکر و شعور کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں یکسانی اور یک رنگی نہیں ہے۔ یہ علامات اس کے جو رنگارنگی ان کے شاعرانہ تجربات میں ہے وہی ان کی شاعری کے وزن و آہنگ میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس سے قبل اس حقیقت کی وضاحت تفصیل سے کی جا چکی ہے کہ غالب زندگی اور حرکت کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں انفعالیات ہندی نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی بیشتر غزلوں میں ایسا وزن و آہنگ ملتا ہے جو انفعالیات سے زیادہ فعالیت کا ترجمان ہے بلکہ یہ کتنا زیادہ سمجھا ہے کہ مجموعی طور پر ان کی غزلوں کے آہنگ میں ایک بلند آہنگی نظر آتی ہے۔ ان کا آہنگ رواں دواں ہے۔ اس کی کیفیت میدانوں میں بہنے والے دریا کی لہروں کی سی نہیں ہے بلکہ سمندر میں پیدا ہونے والے مد و جزر کی سی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ غالب بنیادی طور پر رومانی ہیں اور ایک رومانی کی حیثیت سے ان کی طبیعت میں ایک تیزی اور تندگی ہے۔ چنانچہ یہی تیزی اور تندگی ان کی شاعری کے آہنگ میں بھی متی ہے۔ اس سلسلے

میں سب سے پہلے ان کی شاعری کو دیکھنے اور سننے والے کی تجربوں کے انتخاب پر پڑتی ہے۔ غالب نے اپنے فنّی اہلکار کے لئے بیشتر دواں دواں بھروں کا استعمال کیا ہے۔ ان کے یہاں بہت طویل بھریں نہیں ہیں۔ بہت چھوٹی بھریں بھی انہوں نے استعمال نہیں کی ہیں صرف کسی خاص موڈ کو پیش کرنے کے لئے انہوں نے بعض چھوٹی بھروں سے کام لیا ہے۔ لیکن ان چھوٹی بھروں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ بیشتر بھریں جو ان کی شاعری میں استعمال ہوئی ہیں، وہ ایسی ہیں جن میں تیز اور تند خیالات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، جن میں حقیقت کی پرواز کو بھی ایسر کیا جاسکتا ہے، جن میں نشاط و طرب کے مساحات بھی بخوبی ادا ہو سکتے ہیں اور جن میں عجمِ دل، عجمِ روزگار اور عجمِ حیات کی واردات کو بھی اچھی طرح ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

بھروں کے انتخاب اور استعمال میں شاعر کی مخصوص ذہنی کیفیت اپنے آپ کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے۔ غالب ایک ایسی شخصیت کے شاعر ہیں کہ چاہے وہ کسی قسم کے جذبات کی ترجمانی کریں، ان کی اس ذہنی کیفیت کا عکس ان میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ شفا وہ کسی عالم میں بھی جینے اور زندہ رہنے کی آرزو کو خیر باد نہیں کہہ سکتے۔ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اس خواہش اور آرزو کا چراغ ان کے یہاں فروزاں رہتا ہے۔ ناسازگار حالات بھی ان کے خیال میں زندگی کا حقیقہ ہیں۔ اس لئے وہ ان کو برداشت کر سکتے ہیں۔ ان کو سازگار بنانے کے لئے بعض صورتیں نکال سکتے ہیں۔ اگر یہ صورتیں نہ پیدا ہوں تو وہ کبھی اس کو زندگی کا قانونی تصور کر کے کبھی انسان کو ان کے سامنے مجبور اور معذور خیال کر کے اپنے آپ کو

ملتی کر لیتے ہیں۔ اور بعض دوسرے راستوں پر چل پڑتے ہیں اور کسی نئے افق پر پرواز کرنے لگتے ہیں۔

غالب نے بھی بھروسہ کو زیادہ استعمال کیا ہے، ان کے پس منظر میں یہی صحتِ حال نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کے یہاں جو مخصوص جبری بعض مخصوص خیالات اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے زیادہ استعمال ہوئی ہیں، ان کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہو سکتا ہے

نقشِ زیادہی ہے کس کی شریعتِ عزیر کا
لا ندی ہے پر یہی ہر پیکرِ تصور کا

حقیقت سے طبیعت نے زلیلتِ لازمہ پایا
درد کی دوا پائی درد و بے دوا پایا

میں ہوں اور افسردگی کی آمد و غالب کو دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُشیا جل گیا

دل میں پھر گریہ نے اک شور مچایا غالب
آہ جو تلوہ ڈنکلا تھا سوطِ دل سے نکلا

دلک میں مر گیا جو زبابِ نبردِ صفت
عشقِ نبردِ ہمیشہ طلبِ گارِ مردِ صفت

دوسری میں نقش و فادر جستلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

ساکش گر ہے ز اداس قدر میں باغ و میناں کا
وہ اک گلہ مست ہے ہم جنودوں کے طاق نیاں کا

دیکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تنم ہے سر و چراغاں کا

محبت تھی چین سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کو سوچ بولے گل سے ناک میں آنا ہے دم میرا

مرا پا رہی عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور انیس حاصل کا

عوم نہیں ہے تو ہی نواہے راز کا
یاں وہ جو عجب ہے پردہ ہے ساز کا

شب سہتی پھر انجم رخشنہ کا منور کھلا
اس تکلف سے کہ گریابت کہے کا در کھلا

شب کو برق سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلہ جواہر اک کھلتے گرداب تھا

میں کہ دشواری ہے ہر کام کا آسان ہونا
کدی کو بھی میسر نہیں افسانہ ہونا

دوستِ غمِ خواری میں میری سی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تک ناخنِ زہرہ آئیں گے کیا

میں اور بزم سے یوں تشنہ کام آؤں
گرہیں نے کی تھی قرب ساقی کو کب ہوا تھا

عوضِ نسیبِ عشق کے متا بل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا !

ذکر اس پری دشت کا پہرہ بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازِ دواں اپنا

غافل بہ وہم تاز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شادِ صبا نہیں مژدہ نگاہ کا

علم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
بُرق سے کرتے ہیں روشنی شمعِ خامِ خاں ہم

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ بے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھری لگے رکھ کر مڈرستی ایک دن

دائم پڑا ہوا ترے دُور پر ہنسیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی ہے کہ پتھر ہنسیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لادو لگی میں غایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پناہ ہو گئیں

دیوانگی سے روش پر زناں بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجہ فناں کیوں ہو
نہ ہو جیبِ دل ہی پہلو میں تو پھر مریں زباں کیوں ہو

ہے بزمِ بجاں میں سسنی آزاد ہوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامدِ ظہور سے

بری ہستی فضا نے حیرت آباد قسمت ہے
چھ کتے ہیں نار وہ اسی عالم کا عتقا ہے

دیکھنا قسمت کو آپ اپنے پر شک اب جائے ہے
میں اُسے دیکھیں بھوک بھوسے دیکھا جائے ہے

غالب کی ہندیدہ بحرِ بھیڑیں بھی ہیں جن میں مندرجہ بالا اشعار کی تخلیق کی گئی ہے۔ ان بحرِوں کا آہنگ دواں دواں ہے۔ ان میں تیزی اور تندی ہے۔ ان میں ایک رک رکھاؤ ہے۔ ایک نئے دیے رہنے والی کیفیت ہے۔ غالب نے ان بحرِوں میں اپنے خیالت کا ہر گوشہ اکر بھی اشعار کی تخلیق کی ہے ان کے تجربے کا آہنگ ان بحرِوں کے آہنگ سے پوری طرح مناسبت رکھتا ہے۔ غالب کے تجربے کی گہرائی نے ان بحرِوں کو زیادہ مستقیم بنا دیا ہے۔ تجربے کی نسبت سے ان بحرِوں میں الفاظ کی محسوس دروبست نے ان کے اندر زیادہ فنگلی اور موسیقیت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ نیک ہے کہ اپنی ان ہندیدہ بحرِوں میں غالب نے مختلف ذمیت کے تجربات کو سمو دیا ہے لیکن ان کے موڈ کی ہم آہنگی اور وحدت کو نہیں نہیں گنتی، اصرار وہ موڈ زندہ رہنے، دوسروں کو زندہ رکھنے، زندگی کی مستحق سے سبز بھرینے اور ان مستحقوں کو عام کرنے کا موڈ ہے۔ غالب کی ان ہندیدہ بحرِوں کا آہنگ اسی موڈ کا آہنگ ہے جو ان کے فنی میں ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

(اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب کے یہاں اس موڈ کے علاوہ کوئی

اور موڈ طاری ہی نہیں ہوتے۔ ایسا نہیں ہے۔ ان کے یہاں شاعری میں ایسے موڈ بھی ملتے ہیں جن میں تڑپ دیاں کا آہنگ غالب معلوم ہوتا ہے۔ غالب کے ایسے دو عالمی مزاج شاعر کے یہاں اس موڈ کا پیدا ہونا ایسا کچھ عجیب نہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے ایک دو عالمی شاعر کو اس قسم کے موڈ کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ غالب پر بھی ایسے موڈ طاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس موڈ کی ترجمانی اور عکاسی کرنے کے لئے انہوں نے چھوٹی بھری استعمال کی ہیں۔ ان کے دیوانوں میں ان چھوٹی بھری کی تعداد دوسری بھری کے مقابلے میں نسبتاً بہت کم ہے۔ لیکن جتنی فزیز بھی چھوٹی بھری میں ہیں وہ آہنگ اور وزن کے اعتبار سے نہایت مؤثر ہیں۔ ان کا آہنگ تو دونوں میں نشر بن کر اتر جاتا ہے بلکہ ایک ایسے تیرنیم کش کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو دل میں اترتا تو بے لکھن بگڑ کے پار نہیں ہوتا۔

غالبہ کی چھوٹی بھری کے یہ اشار ان کے تجربے کی اسی کیفیت کو

ظاہر کرتے ہیں۔

ہوس کو بے نشاد کار کیا	زبورنا تو بجنے کا مزہ کیا
تہاں پیشگی سے مدح کیا	کھاں ملک اے سراپا ناز کیا کینا
نردش اے بے جا دیکھتا ہوں	شکایت اے رنگیں کا لگا کیا
کیا کس نے سبکو داری کا دعویٰ	ٹھیک خاطر عاشق مجھ کا کیا

جانتے ہیں ہے غالب اس کی ہر بات

مبارت کیا اشارت کب ادا کیا

قدوہِ محنت کش دُورا نہ ہوا میں نہ اچا ہوا بچا نہ ہوا
 ہم کہاں قسمت اُڑانے جاویں تو ہی جیبِ خنجر اُڑا نہ ہوا
 ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا
 زخمِ گروب کیا ہو نہ متا کام گر مڑ گیا روا نہ ہوا
 کچھ تو پڑیے کر لوگ کھتے ہیں
 آج غالبِ غزل سرا نہ ہوا

پھر مجھے دیدۂ تری یاد آیا دلِ صبرِ تشہِ قریاد آیا
 دمِ بیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر تو وقتِ سفر یاد آیا
 زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی کہیں تو راہِ گھڑ یاد آیا
 پھر ترے کوپے کو جاتا ہے خیال دلِ لگم گشتہ مگر یاد آیا
 کوئی دیرانی سی دیرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھریاد آیا
 میں نے جنوں پر لڑکھن میں اسد
 حلقِ آشایا تھا کرسد یاد آیا

نہ لگی تفرہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
 تو اور آرائشیں خیمِ لاکھ میں اور اندیشے ہائے دید و راز
 ہوں گرفتِ رقصِ سیار ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
 بے کر پر چا تر کچھ غنیمت نہ ہوا میں غریب اور تو غریب فراز
 اسد اللہ خان تمام ہوا
 اسے دہینا وہ رند شاہِ باز

وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شب و روز واد وصال کہاں
 فرصت کار و بارِ شوق کہے ذوقِ نفاہ و جمال کہاں
 حق وہ اک شخص کے قصہ سے اب وہ زمانہ خیال کہاں
 ایسا آسان نہیں ہو دونا دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
 معطل ہو گئے ترقی حنا کہے
 وہ عناصر میں امتدال کہاں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ادم دیکھتے ہیں
 بنا کر فیروں کا ہم بھیس غالب
 تماشا کے اہل کرم دیکھتے ہیں

راہِ مستوق نہ رسوا ہو جاتے ورزہ خرابانے میں کچھ بید نہیں
 گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے غمِ عسوی جاوید نہیں
 کہتے ہیں جیتے ہیں امید پر لوگ
 ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

آہِ لاکسی نے اثر دیکھا ہے ہم بھی اک اپنی ہوا باز مچتے ہیں
 اہلِ تدبیر کی دامانِ دگیں آہوں پر بھی حنا باز مچتے ہیں
 سادہ چڑکار ہیں خراباں غالب
 آہوں پر بھی حنا باز مچتے ہیں

عشق مجھ کو نہیں دخت ہی ہے میری دخت تری شہرت ہی ہے
 ہم بھی تسلیم کی خوشدلیں گے بے نیازی تری عادت ہی ہے
 یہ سے جیسٹ سپل ہائے است
 گر نہیں وصل تو سرت ہی ہے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے ہی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
 جو چٹکیں غالب بلائیں سب تمام
 ایک رگب ناگہانی اور ہے

کوئی آسید بر نہیں آتی کوئی صدمت تو نہیں آتی
 آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کس بات پر نہیں آتی
 مرنے ہیں آواز میں مرنے کی موت آتی ہے پر سنیں آتی
 کبھی کس مرنے سے جاؤ گے غائب
 حرمِ تم کو مگر نہیں آتی ا

دلِ ناماں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
 ہم میں کشاق اور وہ بیزار یا اپنی یہ مایوسد کیا ہے
 میں بھی مرنے میں زبان رکھا ہوں کاش پرچہ کو تک عا کیا ہے
 پھر کچھ اک دل کو بیتیاری ہے سیز جو یاسے زخم کا ہی ہے
 پھر جگر کھودنے لگا ناخن آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
 وہی صد رنگ نادر فرسائی وہی صد گردِ اشکیا ہی ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

غریب غفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشذب پنہلم کے
غفل کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ تھکنڈے ہیں چرب و نیل خام کے
عشق نے غالب مکت کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے!

کب وہ سنا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانِ میری
غزل غمزہ خون ریز نہ پڑچھ دیکھ خونِ تابہ نشانی میری
کیا بیان کر کے مراد میں گئے یار مگر آشفتہ بیانی میری
کو دیا صنعت نے عاجز غالب
ننگِ ہمیری ہے جوانی میری

غالب کے متداول ویران میں چھوٹی بھروں کی یہ خزیں پندہ
ہیں سے زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن جیسا کہ ان غزلوں کے مندرجہ بالا
انتخاب سے ظاہر ہے ان کا مخصوص وزن و آہنگ غالب کی اس
مخصوص ذہنی کیفیت کی عکاسی اور اس خاص سرٹ کی ترجمانی کرتا ہے
جس سے وہ اس وقت گزرے ہیں جب ان اشعار کی تخلیق کا سلسلہ
جاری تھا۔ ان میں سے بیشتر اشعار کے آہنگ میں آہستہ روی اور
دھماپن ہے اس لئے کہ غالب نے جن تجربات کو اس وزن و آہنگ

کے سامنے ہیں وصال ہے اس میں کسی نہ کسی حد تک ایک تحزینہ کیفیت ضرور ہے۔ اس تحزینہ کیفیت کا جن کہیں احساس عروسی ہے، کہیں ماضی کا ماتم، کہیں نشاط و طرب سے علیحدگی، کہیں انسانیت کا غم، لیکن وہ آہنگ جو اس تحزینہ کیفیت کا ترجمان ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دلوں میں آتر جاتا ہے۔ جو اس کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور اس طرح احساسِ حال کی ٹیکس کا باعث بنتا ہے۔

اس آہنگ میں جو غالب کے یہاں پیدا ہوتا ہے وہ موسیقیت اور نمٹنگ ہے جو خود انسانی زندگی کے نشیب و فراز اور اس سے پیدا ہونے والے آہنگ میں پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اس آہنگ کی جھلک نظر آتی ہے جس کو ورڈ سوئوٹھ نے (STILL SAD MUSIC OF HUMANITY) کہا ہے۔ اس آہنگ کے ساتھ انسان، افسوس ہے کیونکہ وہ بہر حال اس کے سائے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ غالب نے اس آہنگ کی تحقیق میں گہرے انسانی شعور کا انداز لگایا ہے۔

غالب الفاظ کے عنصر میں دروبست سے بھی اپنے وزن و آہنگ میں ایک ایسی موسیقیت اور نمٹنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو ان کی شاعری کے آہنگ میں جان ڈال دیتا ہے۔ غالب کے شاعرانہ تجربے میں جو باتوں کی اور نظم و ضبط ہے، اس کی جھلک الفاظ کے اس استعمال میں بھی نظر آتی ہے جو ایک عنصر دروبست کی وجہ سے ان کی شاعری کے آہنگ کو موسیقیت اور نمٹنگ سے بھکار کرتے ہیں۔ یوں تو غالب کی شاعری کے آہنگ میں یہ موسیقیت اور نمٹنگ بہ جبر ملتی ہے لیکن مزاج

ذیل چند اشعار اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

دل گذر گاہ خیال سے و ماضی ہی سہی
گرفتارِ جادۂ سر منزلِ تقریٰ نہ ہوا

غوشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گوہرِ بیاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سر تک اکودہ ہزار تیری مژگان کا

میں ہیں کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشہ بساط ہے سر شیشہ باز کا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دست کا کھاؤں قریب
آستین میں دشتِ پناہ اعدا میں خبر کھٹ

نوازشِ اے بے حجب دیکھتا ہوں
شکایتِ اے رنگیں کا گلا کب

اندھم وہ جنوں جوں گواہے بے سرو پا ہیں
 کہ ہے سر پہنچے مرزا گن آہر پشت غار اپنا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا جو
 اس میں کچھ شائبہ غریب تقدیر میں صحت

فاسل بہ وہم ناز خود آرا ہے دردِ پاں
 بے شائبہ صبا نہیں طرہ گیارہ کا

تو اور آتشِ حنم کا کل
 میں اور اندیشہ اتنے دور و دراز

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
 برق سے کرتے ہیں مددِ شمشامِ حنا ہم

منہ صبت کا رو بارِ شرقِ رکھے
 فدوی قنارۂ جمال کہاں

یادِ محض ہم کو بھی رنگارنگ بزمِ آرائیاں
 لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

پسش طرزِ دہری کیجئے کیا کر پنا ہے
اُس کے ہر اک اشامے سے مجھے ہے یہ ادا کریں

تھے عشرت کی خواہش ساقیِ مکر دوں سے کیا کیجئے
تھے مٹیا ہے اک دو چار جامِ داڑ گون وہ بھی

کس طرح کاٹے کوئی شبِ ہائے تار پر نکال
ہے نذرِ غرورِ اخترِ شکاری ہائے ہائے

چشمِ خوبانِ نامشی میں بھی نوا پرواز ہے
مرم تو کوسے کو دو مشعلِ آواز ہے

گرچہ ہے طرزِ کفائفِ پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کونے جاتے رہیں کہ وہ پا جائے ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخِ ہمارا دل سہی
فقرۂ شہرِ قیامت کس کی آبِ دل میں ہے

(۱) اشار میں گندہ گامِ خیال سے دماغِ جلوۂ سرمزنی تقویٰ
منوشی میں منانِ خونِ گشتہ لاکھوں آرزوئیں، سرِ تنکِ آلودہ ہرنا جیسی
مترگان کا جوشِ بادہ سے خیشے اکھل رہے۔ آئین میں دشتِ پستانِ ناتھ

میں خنجر کھلا ، نوازش اٹے بے جا ، شکایت اٹے رنگیں ، سر پہنچہ مڑکان
 آہو ، شائبہ سحرئی تقدیر ، بے شانہ صبا ، آرائش غم کا کل ، اندیشہ اٹے
 دودھ و سارا ، برق سے کرتے ہیں روشنی شمع ماتم نماز ہم ، فرصت کاروبار
 مشرق ، ذوق لطائف جمال ، رنگ و رنگ بزم کراتیاں ، نقش و نگار عاق نیاں ،
 پرکشش طرز و لہری ، سے عشرت کی خواہش ، دو چار جام واذگون ، شب
 اٹے سار برشمال ، خور وہ اختر شماری ، چشم خواب خامشی میں بھی ، دودھ
 شط آواز ، پردہ و دروازہ حش ، جلوہ زار آتش ووزخ ، قند شریعت
 و غیرہ کی بے شمار ترکیبوں ، فقروں اور محبوں میں جو فنگی اور موسیقیت
 ہے وہ بڑی ہی دلنشین اور دل آویز ہے ۔ اور ان کی اس دل نشینی اور
 دل آویزی کو اندازہ دانی پڑھنے والے اور سننے والے کے حواس ہی
 کر سکتے ہیں ۔ غالب کا کلام اس قسم کی فنگی اور موسیقیت سے بھرا پڑا ہے ۔
 یہ ہر ذات خود بھی اہم ہے ۔ لیکن مجموعی طور پر یہ فنگی اور موسیقیت ان کی
 شاعری کے مجموعی آہنگ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور اس کو زیادہ مؤثر
 بنا کر جمالیاتی اعتبار سے زیادہ دلنشین و دلخیز بناتی ہے ۔

اس اعتبار سے غالب بڑے چابک دست فن کار ہیں ۔ وہ صرف
 ترکیبوں ، فقروں اور محبوں کی تراش تراش ہی سے اپنی شاعری کے آہنگ
 کو مؤثر نہیں بناتے ۔ لیکن خاص کیفیات کی وضاحت کے لئے ایسی مترنم
 زمین کا انتخاب کرتے ہیں جو الفاظ اور ان کی ترکیبوں کی مخصوص درودیت
 سے کچھ زیادہ بھی مترنم ہو جاتی ہیں اور ان کی شاعری کا مجموعی آہنگ
 ان کے ہاتھوں زیادہ جان دار اور مؤثر ہو جاتا ہے ۔ دیکھئے کہ کبھی کبھی
 دل کش زمین میں غالب نے بلع آبنائی کی ہے اور الفاظ کے مخصوص

استمال، ترکیبوں کی مخصوص تراش خراش اور نغزوں کے مخصوص درجہ سے اسوں نے مندرجہ ذیل غزلوں میں رقص، موسیقیت اور نغمگی کی ایسی کیفیت کو ابھار دیا ہے جو ایک رقص و لغزیب کے سنسکرت لطف کو آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ غزلیں کیا ہیں خود شاعری اور اس کے فن کا ایک رقص و لغزیب ہیں۔

کھتے ہو نہ دیں مجھے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کر گم کیجئے ہسم نے دیا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد ہے دوا پایا
دوست دار دشمن ہے امتدادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھیں نالہ تار سا پایا
سادگی و پرکاری بے خودی و مہربانی
حق کو تقاضا میں جرات آزما پایا
غمنچہ چہرہ نکال کھینچے آج ہم نے اپنا دل
خون کیا بہا دیکھا، گم کیا بہا پایا
حالی دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یقینی
ہم نے بار بار ڈھونڈا، تم نے بار بار پایا
شعرِ پندِ ناسخ نے جسم پر تنگ چھڑکا
آپ سے کوئی تہچہ تم نے کیا مزا پایا

ذکر اس پر ہی دش کا اور پھر بیاں اپنا
 بی گیار قیبت آخرت جورا زواں اپنا
 منظر اک بندی پر اور بسم بنا سکے
 حوش سے ادھر ہو تا کاش کہ مکان اپنا
 دے وہ جس قدر وقت ہم نہیں ملے گا
 بادے آشتا نکلاں کا پستان اپنا
 درو دل کھوں کب تک جائوں ان کو دکھائوں
 انگلیاں فلکار اپنی خامر غن چکاں اپنا
 تاکرے زخمازی، کر یا ہے دشمن کو
 دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زبان پڑا
 ہم کہاں کے دانا تھے کسی جہیز میں کتا تھے
 بے سبب ہوا غالب دشمن آسان اپنا

دل ہی تو ہے زسنگ دشت درو سے بھر دئے کیوں
 رو نہیں گئے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں !
 دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں آستان نہیں
 بیٹھے ہیں وہ گزرو پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں
 جب وہ جمال دل فروز صورت مہر نیم روز
 آپ ہی ہو فلکار، سوز پر سے میں منہ چھپائے کیوں
 دشت غمزہ جان بستان نادرک تاز بے پناہ
 تیرا ہی کبھی رخ بھی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غمِ اصل میں دونوں ایک ہیں
 موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
 حق اور اس پر حق غم رہ گئی بڑا دوس کی شرم
 اپنے پر اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
 وہ وہ عز و عز و تازہاں یہ حجاب پاس دینا
 لہا میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا ہیں
 جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی لگی میں جائے کیوں
 غائبِ شہر کے جبر کوئی سے کام بند ہیں
 وہ بے زاد زار کیوں، کیجئے آئے آئے کیوں

غنیمتِ ناممکنہ کو دور سے مت دیکھا کریں
 بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے لے جا کر یوں
 پرسش طرزِ دلیری کیجئے کیا کوئی کہے
 اُس کے ہر اک اشارے سے تلخ ہے یادِ اکریوں
 رات کے وقت سے بچے ساتھ رقیب کو سنے
 آئے وہ ہاں خدا کرے پڑ نہ خدا کرے کریوں
 میرے رات کیا بنی یہ جو کہا کر دیکھئے
 سامنے آہن بیٹھا اور دلچسپ کریوں
 بزم میں اس کے روبرو کیوں خوش بیٹھے
 اُس کی تو خاموشی میں ہی جہنم کی آگ

میں نے کہا کہ بزمِ نماز چاہیے غیر سے ہستی
 سسکی کے ستمِ غریب نے لہجہ کو اٹھا دیا کہ یوں
 لہجہ کو کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
 دیکھ کے میری بے خودی پہنے گی ہوا کہ یوں
 کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی دمنش یاد تھی
 آمیزہ دار بن گئی سیرتِ نقشب پا کہ یوں !
 گزرتے دل میں مہر خیال وصل میں شوق کا زوال
 موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں
 جو یہ کہے کہ رینے کیونکہ ہو رشکِ نادر کسی
 گلشنِ غالب ایک بار پڑے کہ ہے سنا کہ یوں

کارِ گاہِ ہستی میں لالہ و داغِ سالان ہے
 برقِ خرمینِ دستِ خویِ گرم و بہتان ہے
 غنیمتِ ہاشم گشتی ! برگِ عافیتِ معلوم
 باوجودِ طبعیِ خواب گل پریشان ہے
 ہم سے رنج بے تاب کی کس طرح اٹھایا جاتے
 داغِ پشتِ دستِ عجزِ شلوخِ بدنِ جان ہے

میہ پانچ فرمیں غالب کے متبادلِ دیران میں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر خود
 پڑھنے والے کا احساسِ جہاںِ رقص کرتا ہے کیونکہ جن زمینوں میں یہ کہی گئی ہیں،
 آج بھی ہر ذاتِ خود بھی ایک رقص کا سا عالم نظر آتا ہے۔ پھر ان میں شاعر

کے خیالات رقص کرتے ہیں ، اسی کے احساسات رقص کرتے ہیں ۔ انسانا
 رقص کرتے ہیں ، ترکیبیں رقص کرتی ہیں ، شاعری رقص کرتی ہے ، اظہار و
 ابلاغ رقص کرتا ہے ۔ طرغ ان میں رقص ہی رقص ہے ۔ اُن اُن گنت عناصر
 کا رقص جس کے مجموعی استراج سے فن اور جالیاتی اظہار کی تشکیل ہوتی ہے ۔
 اور رقص کے اس آہنگ کو غائب کی اس ذہنی اور جذباتی کیفیت
 نے تخلیق کیا ہے جو ان کے فن اور جالیاتی اظہار کا بیج اور خرچ ہے ۔
 غائب ، جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا گیا ہے ۔ خیال اور جالیاتی اظہار ،
 مواد اور فن کی ہم آہنگی کے فن کار ہیں ۔ غزموں کے لئے حلقہ زمینوں کا
 انتخاب بھی انہوں نے اسی ہم آہنگی کے شعور کے زیر اثر کیا ہے ۔
 چنانچہ اسی ہم آہنگی کے شعور کا یہ نتیجہ ہے کہ انہوں نے آہنگ کی
 مخصوص کیفیت کی ترجمانی کے لئے بسنے ایسی زمینوں کو استعمال کرنے کا
 تجربہ کیا ہے جو اردو شاعری کی روایت میں بہت عام نہیں ہیں ۔ یہی
 غائب نے تجربے کے خاص آہنگ کی ترجمانی کے لئے ان زمینوں کو استعمال
 کیا ہے ۔ بلکہ یہ کتنا زیادہ عجیب ہے کہ ان کی تخلیق کی ہے ۔ یہ زمینیں عام
 طور پر مروج نہیں ہیں ۔ لیکن غائب نے ان کو کسی خاص کیفیت کو ظاہر
 کرنے کے لئے رواج دیا ۔ ان زمینوں کا وزن و آہنگ دیکھئے ۔

تم اپنے شکوت کی باتیں ذکر و کھود کر پوچھو
 خدا کرو میرے دل سے کہ میں آگ ہوئی ہے
 وہاں وہ دہلے بھی تو مستنم ہے کہ آئندہ
 زلزلہ سحری ہے خدا و نیم بھی ہے

جب فتادے جلاو کے چلے ہیں ہم آگے
 کر اپنے ساتھ سے ہریاڑں سے ہے دو قلم آگے
 قتلانے تاجے ہا! خراب بادۂ اُلفت
 فقط خواب کھائیں نہ پہل سکا قلم آگے
 جنم ناز نے جھاڑی فتادشت کی مستی!
 وگرد ہم بھی آٹھاتے تھے لذتِ ام آگے
 خدا کے واسطے داد اس جنوں شوق کو دینا
 کہ اس کے در پہ پہنچے ہیں نامربر سے ہم آگے
 یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
 تمہارے آئینہ اے طرہ ہائے علم بہم آگے
 دل و جگر میں پر انشاں جو ایک موجوں ہے
 ہم اپنے زخم میں کبے ہوئے تھے اس کو دم آگے
 قسم جہان سے ہونے کی میرے کھاتے میں تاب
 ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

ان فزوں میں جو مضمون آجنگ ہے اس سے واقعی یہ محسوس ہوتا
 ہے کہ شکوے کی باتیں کوئی کھود کر پوچھ رہا ہے جیسے واقعی کسی کے دل میں
 آگ دلی ہے۔ جیسے واقعی کوئی درد و الم کو مستغرق تصور کر رہا ہے۔ جیسے
 واقعی گر یہ سحری اور آہ نیم شبیں کی کیفیت بانی نہیں رہی ہے۔ دوری
 منزل میں حلقہ اشعار اگرچہ حلقہ موضوعات کو پیش کر رہے ہیں یہ سکن
 مجموعی طرد پر بحر کا نیا آجنگ ان میں سے ہر موضوع کی صحیح کیفیت کو ظاہر

کر دیتا ہے اور نئیوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے نئی زمین کا آجنگ
 اسی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے تخلیق کیا۔ بہر حال غالب نے نئے آجنگ
 کو پیدا کرنے کے لئے نئی زمینوں کو وجود میں لانے کے بعض تجربے بھی کئے۔
 یہ تجربے موضوع اور فن کی مناسبت اور ہم آہنگی کو نمایاں کرنے کے سلسلے
 میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ غالب نے ان کے ذریعے سے ایک نئے
 آجنگ کو وجود میں لا کر ایک اہم فنی کارنامہ انجام دیا ہے۔

ردیف و قوافی کے صحیح اور مناسب استعمال نے بھی غالب کی
 عزوں کے مخصوص وزن و آجنگ کی تخلیق میں نمایاں کام کیا ہے۔ غالب
 ردیف یا قوافی کے سارے شاعری نہیں کرتے بلکہ شاعری کے سارے ردیف و
 قوافی کو تخلیق کرتے ہیں۔ غزل کے فن میں ردیف و قوافی کی تخلیق شاعر کا
 بڑا کارنامہ ہے۔ غزل کا فن ایسا ہے کہ بعض شاعر اپنے آپ کو صرف تانیہ
 بیانی تک محدود کر لیتے ہیں۔ چنانچہ شاعری اور اس کا فن تو اس کا ساتھ
 چھوڑ دیتا ہے اور اس کی جگہ ان کے یہاں صرف تانیہ بیانی رہ جاتی ہے۔
 غالب کی شاعری ظاہر ہے کہ تانیہ بیانی نہیں ہے۔ وہ شاعر ہیں اس
 لئے ردیف و قوافی کا استعمال انہوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے
 کیا ہے۔ اور ان کے فنکارانہ شعور نے ردیف و قوافی کے اس استعمال
 میں بڑے پہلو پیدا کئے ہیں، اور اس کو ایک فن بنا دیا ہے۔ یہی
 وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں ردیف و قوافی کے استعمال کی نئی حیثیت
 پڑھنے والے کو قدم قدم پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ غالب ان کے
 استعمال سے اپنے فن میں وزن و آجنگ کی نئی دنیایں پیدا کرتے ہیں۔
 ان سے ان کا آجنگ زیادہ زور دار ہو جاتا ہے۔ اس میں زیادہ جان

پیدا ہو جاتی ہے۔ زیادہ مستزیم کیفیت کا وجود ہوتا ہے۔ زیادہ موسیقیت اور نفسی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی وجہ سے مسنویت کا انھار زیادہ پہلو دار طریقے سے ہوتا ہے۔ غالب کی یہ غزلیں ردیف و قوافی کے مناسب اور مناسب استمال کی بستر پر مشامیں ہیں۔

دل مرا سوزِ نساں سے بے محابا جہل گیا
آتشِ خاموشی کی مانند گریا جہل گیا

سناکش گر ہے زاہد جس قدر اس بارخِ رضاں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نیاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشِ تیرے سبلو سے
کرے جو پر تو نورِ شید عالمِ شبستان کا
نظر میں ہے ہماری جاوہِ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالمِ اجساد سے پریشاں کا

دوست غمِ خواری میں میری سی فزائیں گے کیا
زخم کے بڑھنے تک ناسخِ زبرِ باقیں گے کیا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کب کب
نہ ہو مرنا تو بیٹے کا مزہ کب

دور و منست کشی دورا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا نہ برا نہ ہوا

میں اور بزم سے سے تشنہ کام ہوں
گرمی نے کی تھی تو بہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہوئی مدت کو غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کٹنا کریں ہوتا تو کیا ہوتا

جور سے باز آتے پر باز آئیں کب
کتنے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلاؤں کب

حسنِ غمزے کی کشاکش سے چٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ حبس میرے بعد

ہے جس کو ہر اک ان کے اشارے میں نشانہ
کہتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گناہ اور

درخِ نگار سے ہے سوزِ جاودا کی شمع
ہوئی ہے آتشِ محبِ زندگانی شمع

آہ کو چاہے اک عراثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلفت کے سر ہونے تک

ہے کس قدر ہلک فریب ہوا سے گل
بہل کے کاروبار پہیں تندرہ اسے گل

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
برق سے کرتے ہیں روشنی شمعِ عالمِ خانہ ہم

وہ سسراق اور وہ دھمال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

مردان ہو کے بٹاویے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر ابھی سکوں

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت سے ہستی ایک دم
ہم ہم پھیری گئے رکھ کر غدرِ مستی ایک دن

پترے تو سن کو مہا باندھتے ہیں
ہم بھی معنوں کی ہوا باندھتے ہیں

دامِ پڑا ہوا ترسے دُور پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ چہتر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لارہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پناہ ہو گئیں

دراستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجئے ہمارے ساتھ صداقت ہی کیوں نہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گنگو تو کیوں کہ ہو
کے سے کچھ نہ ہوا پھر کہ تو کیوں کہ ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نواسخ تھاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر نہ میں زبان کیوں ہو

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک تہہ غنم وہ بھی
سُور جتا ہے ہاندانہ چکیدن سرنگوں وہ بھی

دو دے میرے ہے تجھ کو بیتیاری اتے اتے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شمای اتے اتے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی ہے
میری وحشت تری مشرت ہی ہے

دیکھتا قسمت کہ آپ اپنے پر شک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے عشاقی اور ہے

دلِ نادان تجھے ہوا کب ہے
آخر اس دور کی دوا کب ہے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جو یائے زخم کاری ہے

نہ ہوئی گزمرے مرنے سے قتل نہ ہوئی
امتحان اور بھی باقی ہیں تو یہ بھی نہ ہوئی

ہر ایک بات پر کہتے ہر دم کہ تو کب ہے
تھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کب ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میسری
اور پھر وہ بھی زبانی میسری

نکتہ چینی ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات بہاں بات بنائے نہ بنے

وہ ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے
ہوا رقیب تو ہوتا رہے کب کہئے

کبھی نیکی بھی اس کے ہی میں گرا جائے ہے مجھے
جغنائیں کر کے اپنی یاد شرابائے ہے مجھے

باز یہیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تما مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدح کہئے
مہتیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کو شرابوں مجھ کو غم کیا ہے

مُدت ہوتی ہے بار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے

یہاں غالب کی مختلف غزلیں سے صرف ایک ایک شریعت لکھا گیا ہے۔ صرف اس خیال سے کہ ان کی غزلیں میں ردیف و قافی کے استعمال کی فنی حیثیت کی وضاحت ہو جائے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں ردیف کے ساتھ ہر شعر میں جو تانیہ استعمال ہوتا ہے وہ ایک نئے آجگ کو پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن جو اشارہ اوپر نقل کئے گئے ہیں ان سے غالب کی شاعری میں ردیف و قافی کے استعمال کی فنی کارنامہ اہمیت واضح مزور ہو جاتی ہے۔ غالب کے ردیف و قافی بے مابا جمل گیا، گویا جمل گیا، باغِ رمضان کا، طاقِ نسیان کا، شبستان کا اجڑائے پریشاں کا، فرامیٹ گئے کیا، بڑھ آئیں گے کیا، نشاط کار کیا کیا، بیچنے کا مزہ کیا، دوانہ ہوا، برا نہ ہو، ساقی کو کیا ہوا تھا، کیوں ہوتا کر کیا ہوتا، باز آئیں کیا، دکھلائیں کیا، چھٹا مرے بعد، اہی جہاں مرے بعد، فناں اور، گمان اور، جاودا قیاس، کامرائی خُش، اثر ہونے تک، سر ہونے تک، ہوائے گل، خندہ داسے گل، نام نہان ہم وصال کماں، ماہ وصال کماں، آجی نہ سکوں، سے پرستی ایک دن، عذر مستی ایک دن، صبا بند سے ہیں، ہوا بانڈ سے ہیں، در پر نہیں ہوں میں، پتھر نہیں ہوں میں، عایاں ہو گئیں، پنہاں ہو گئیں، صحبت ہی کیوں نہ ہو، صداقت ہی کیوں نہ ہو، ہو گنگو تو کیوں نہ ہو، کہو تو کیوں نہ ہو، فغان کیوں ہو، نہ بان کیوں ہو، خون وہ بھی، سرنگوں وہ

بھی، بے قراری آئے آئے، غفلت خماری آتے آتے، دھشت
 ہی ہی، شہرت ہی سی، آجائے ہے، دیکھا جاتے ہے، ذذذذ
 اور ہے، غنائی اور ہے، ہوا کیا ہے، وہا کیا ہے، بقیہ قراری
 ہے۔ دھم کاری ہے، فحش مذہبی، یہ بھی نہ سی، تو کیا ہے گنگر
 کیا ہے، کمانی میری زبانی میری شائے نہ بنے، باتے نہ بنے
 بشر ہے کیا کئے، نامہ بر ہے کیا کئے، آجائے ہے مجھ سے،
 خرا جائے ہے مجھ سے، دونا میرے آگے، تا شمارے آگے،
 دے ماکئے، کیا کئے، کم کیا ہے، مہاں کئے ہوتے، چہرا ناں
 کئے ہوتے، جس آہنگ کو پیدا کرتے ہیں، اس کو صرف محسوس
 ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان کی روینیس یہ ذات خود بھی اہم ہیں اور
 ان میں بھی ایک فنگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے لیکن قافی
 کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر تو ان کی موسیقیت اور فنگی میں کچھ
 اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کے صوتی آہنگ کا اثر براہ
 راست حواس پر ہوتا ہے۔ غالب اس اعتبار سے ایک منفرد
 فنکار اور ایک بہت بڑے خالق محال ہیں۔

غرض غالب کے فن میں وزن و آہنگ کی مختلف صورتوں
 کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اس وزن و
 آہنگ کو جالیاتی انہار کا ذریعہ اور وسیع بنایا ہے۔ انہوں
 نے سوز و انداز اور مواد کی مناسبت سے اس وزن و آہنگ کی
 تشکیل کی ہے اور اس سلسلے میں بحر و بحر کا مناسب انتخاب

افاضہ، ترکیبوں، فقروں اور محلوں کی متناسب تراخی و تراشی، رویت و توانی کا نگہ اور موسیقیت سے بھرپور احتمال خاص طور پر ان کے پیش نظر ہے اور ان سب کے عمدہ امواج سے وہ ایک ایسے وزن و آہنگ کی تشکیل میں کامیاب ہوئے ہیں جو ان کے مایاتی اعتبار میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور ان کے فن کا نہایت ہی اہم حصہ ہے۔

درايے کے اثرات

غالباً اپنے مزاج اور اُفتاد طبع کے اعتبار سے ایک باغی
 فن کار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن میں بہن جہتیں بھی
 کی ہیں۔ روایت سے بناوت کے اثرات بھی ان کے فن میں نظر آتے
 ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود روایت کے اثرات ان کے فن پر
 بڑے گہرے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے فن کی جڑیں روایت
 کی زمین میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے فن کا ستارہ درخت
 اسی روایت کی زمین سے کسب حیات کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ
 فضا میں پھیل کر فضا میں پرورش پانے والی گرمی اور روشنی کے
 ماتحت اس میں نئی نئی کوئلیں بھی پھوٹتی ہیں۔

اس سے قبل اس حقیقت کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ غالب
 ایک مذہب کی پیداوار تھے اور اس مذہب کی روایت کو انہوں

کی جو مثال ملتی ہے اس میں خیال آفرینی، رنگینی، پُرکاری اور ایک لطیف رمزیت کے عناصر نمایاں ہیں اور آخر الذکر کے بیان خیال کی جلدی، صافی کی ہمدیگی، زبان میں ایک ترشی ہوئی کیفیت اور اظہار میں ایک ابہام کی کیفیت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ غالب سے قبل اردو شاعری کا ایک دور ایسا گذر چکا تھا جس کے علمبردار میر، سودا اور درو تھے۔ ان جنہوں نے فارسی کی اس روایت کی دونوں صورتوں کے امتزاج سے ایک نئی روایت کی تشکیل کی تھی جس میں سادگی، روانی اور لطیف رمز دہائی کے عناصر زیادہ نمایاں تھے۔ غالب کے فن میں ان تینوں کا اثر ملتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں وہ بیدک کی روایت سے زیادہ متاثر تھے۔ دروئی دور میں نھوتی، حقانی، اور نظیری کی روایت کے اثرات اس اثر میں بلی بلی گئے اور آخری دور میں میر و سودا کی روایت کے اثرات بھی اس میں شامل ہو گئے۔ غالب کے فن میں شری روایت کی ان مختلف صورتوں کا ایک حسین سنگم ملتا ہے۔

یہ بات اس سے قبل بھی کہی جا چکی ہے کہ غالب کا زمانہ فنی اجتہاد کا زمانہ تھا اور اس فنی اجتہاد کے عوامل و محرکات اس زمانے کے دو سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری حالات تھے جنہوں نے اس وقت کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ غالب اور ان کے ہمعصرین کے فن میں جو ایک نیا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ان سب لمبے لمبے اپنے اپنے دائرے میں رہ کر فنی روایت میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے۔ غالب میں اس کام میں بیش

پیش پیش رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں ان سے قبل کی فنِ روایت بعض نئی صورتیں بھی اختیار کرتی ہے لیکن ان صورتوں میں کوئی انقلابی رنگ و آہنگ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مروجہ روایت کو نئے حالات سے ہم آہنگ کر کے ایک نئی شکل دینے اور اس کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کی طرف توجہ دکھائی دیتی ہے۔ غالب کا فن اس اعتبار سے منفرد ہے۔ کیونکہ یہاں نے اسی روایت میں زیادہ ترشی ہوئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اور یہ ان کا بہت بڑا فن کارنامہ ہے۔

اس کی شائیں ترغاب کی شاعری اور ان کے فن میں ہر مبالغہ نثر آتی ہیں لیکن اپنے بعض اشار میں کچھ نظریاتی اور اصولی باتیں اسوں نے ایسی کہی ہیں جن کو سامنے رکھا جائے تو غالب نے روایت کا جو اثر قبول کیا ہے اور اس میں ایک اجتہادی شان پیدا کر کے اسی کو جو ایک نئی صورت دی ہے اس کی صحیح تصویر انھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ اشار ان کے نثرات کے صحیح ترجمان ہیں

کھتا ہوں اسے سوزِ شبنمِ دل سے من گرم
تار کے زکے کوئی میرے حرف پر انگشت

وہی اک بات ہے جو باںِ نفسِ دہانِ نکست گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری دگلیں نوائی کا

سمازد نہیں ہے نثر منکر سنی ہے
تربیا کی تسلیم ہوں دود چراغ کا

ہوں گرمی فضا و قصور سے نثر سخن
میں حندیب گلشنِ نا آفریدہ ہوں

آتے ہیں عیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب سریرِ خامر نوا ہے سر دہش ہے

پاتا ہوں وار اس سے بکھر اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زبان نہیں

میں جو گستاخ ہوں آنجی غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوقِ فزا ہوتا ہے

ز ستائش کی تہا نہ جیسے کی پروا
گر نہیں ہی مرے اشار میں مہنی نہ بھی

آگہی دلم شنیدن جس قدر چاہے بچاتے
دعا عطا ہے اپنے عالمِ قریب کا

میں فروغِ شمعِ سنی دور ہے امد
پسے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

گھٹا کسی پہ کیوں مرے دل کا مسام
شروں کے انتخاب نے رُسا کب بے

نغمہ آئے غم کو ہی اسے دلِ غنیمت با نیچے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساؤ سستی ایک دن

سندِ یاد کی کوئی نے نہیں ہے
تارِ پابند نے نہیں ہے

پیغزل اپنی لہجے ہی سے پسند آئی ہے آپ
ہے روینہ شریں غالب زہی مکرارِ دوست

کہ تو کیسے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غنزل سرا نہ ہوا

ہمارے شعر ہیں اب صرف دلِ مکی کے امد
کھلا کہ فسادِ حوین بہنر میں خاک نہیں

ہیں اور بھی موندنیا میں حضور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے امانت بیاں اور

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکمتر سرا
صلائے عام ہے یا راج نکمتر داں کے لئے

جو یہ کہے کہ رنجیت کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کر یوں

بقدر شوق نہیں کرت سگلتا سے عزلی
کہ اور چاہئے دست مری زبان کے لیے

مستعد ہے ناز و غرور دے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشتِ خنجر کے بنیہ

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گشتِ گو
نہی نہیں ہے بادۂ سامند کے ہنر

یہ اشعار بنیہ کسی ترتیب کے، صرف یادداشت کے سہائے
جہاں نقل کئے گئے ہیں، ان کو پڑھ کر جو نتائج سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں
کہ غالب نے سوزِ شبنمِ دل سے سننِ حرم کی تحقیق کی ہے۔ ان کی

لفز سنجی گرجی نشاطِ فقر کی مَرہونِ منت ہے ۔ ان کا دل گواہت
 ان کی شاعری کا بنس ہے ۔ ان کا انداز بیان منفرد ہے اور وہ ایک
 ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوتے ہیں ۔ انہوں نے ریختے کو رشکِ فارسی
 بنا دیا ہے ۔ عرفِ مہنگائے غزل ان کے لئے کافی نہیں ۔ ان کی زبان
 کے لئے تو کچھ اور دستیں درکار ہیں ۔ انہوں نے ناز و غمزہ کی گفتگو
 و مشاعرہ و فہر میں اور شاہدِ حق کی گفتگو ، باد و ساغر میں کی ہے ۔
 اور ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شاعری اور فن کی
 مروجہ روایت سے استفادہ کیا ہے اور اس کو نئے لغزات اور نئے
 اسایب سے آشنا کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ ان کا جمالیاتی انداز
 ادنیٰ اس صورتِ حال کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے ۔

غالبِ غزل کے فن کار ہیں اور غزل کی کئی سو سال کی فنی روایت
 کو انہوں نے اپنے فن میں بچے سیلتے سے برتا ہے ۔ غالب جہاں تک
 ان کے خیالات و نظریات کا تعلق ہے ۔ ایک انقلابی ہیں ۔ ان کا احساس
 نیا ہے ۔ ان کے خیالات میں جذبہ ہے ۔ ان کے تقریبات بھی نئے ہیں ۔
 لیکن ان سب کا انداز انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ غزل کی روایت
 کو ان کی شاعری میں نہیں گھسی گھتی ۔ عشقِ فضا ، غزل کی روایت کی بنیاد
 ہے ۔ غالب نے اس عشقِ فضا کو اپنے فن میں برقرار رکھا ہے ۔ حسن
 کی کیفیت ، محبوب کے حسن کا عالم ۔ اس کے ساتھ عاشق کے روابط ، اور
 پھر ان روابط کے نتیجے میں عاشق کی حالت ۔ ان سب کی تفصیل غالب
 نے اسی انداز میں پیش کی ہے جو غزل کا مخصوص انداز ہے اور جس
 کو اس روایت کے علم برداروں نے ہر دور میں برتا ہے ۔ عاشق
 لا محبت متاثر ہوا ، اکے کو چھیں جا ، لیکن اکے دیکھا کایب نہ ہوا ، رقیب کا عاشق

کے راستے میں سائل ہوتا، اس کے کوچے میں جانا، لیکن اس کے
 ویدار کا نصیب نہ ہوتا، رقیب کا عاشق کے راستے میں سائل ہونا
 عاشق کا رشک سے مرنا، تاج کا نصیب کرنا لیکن عاشق کا اس نصیب
 کو درخور اعتبار نہ سمجھنا، نامور کے ہاتھوں نامور و پیام کا سلسلہ
 جاری رکھنا لیکن ناکام ہونا اور پھر صراحت کی طرف جانا اور بالآخر
 غنا ہو جانا۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار باتیں غائب نے اپنی
 شاعری میں غزل کی روایت کے سہارے پیش کی ہیں۔ اور اس
 طرح غزل کے فنی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ یہ اشعار اُن کے اس
 فنی میلان کی صیح ترجمانی کرتے ہیں۔

سے حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یقین
 ہم نے بار بار ڈھونڈا، تم نے بار بار پایا

شورِ پندِ تاج نے زخم پر کھچڑ کا
 آپ سے کوئی بدچھتم نے کیا مزا پایا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر کے
 زنداں میں بھی خیالِ بیاباں نروستا

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
 حقِ مغفرت کرے عجب آزادِ مرد ستا

سبزہ خط سے ترا کا کل سرکش نہ دیا
 یہ زمرہ بھی حریف دمِ راضی نہ ہوا
 میں نے چاہا تھا کہ اندھ دغا سے چھوٹوں
 وہ تنگدست مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

بہن میں فکر کی آپ آج سستے میں کیس دنہ
 سبب کیا خواب میں آکر تبسم لئے پنہاں کا

دور پہ رہنے کو کہا اور کہ کے کیا چرگ
 تجھے عرصے میں مرا پنا ہوا بستر کھلا

ٹھیکوں میں میری نش کو کھینچے پھر دو کی
 جاں دادہ ہوائے سر و نگہ دوست

حضرتِ ناصح گزائیں دیدہ و دل فرس راہ
 کوئی بے کویہ نہ کھا دکھائیں گے کب
 آج وہاں تین و کفنِ بانہ سے چوٹے جاتا ہوں میں
 مدد میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قیدِ اچھا یوں ہی
 یہ ہنسی عشق کے انداز چٹ جائیں گے کب

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے میں دوست نامیج
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

مے قروں سوتے میں اُس کے پاؤں کا ہر گر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک قحشا ہوا گلو نہ ہوا

کے میٹریں میں تیرے لب کو رقیب
گایاں کما کے بد مزانہ ہوا

پھرتے کرچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مسگر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
جگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

رنگ کتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کتہی ہے کہ وہ بے ہر کس کا ہشتا

سرجِ خونِ سرے گزر ہی کیوں نہ جائے
 آستانِ یارے اٹھ جائیں کیا
 پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
 کوئی تبادُل کہ ہم بستل میں کیا

آتے ہے بے کسی عشق پر رونا غالب
 کس کے گھر جاتے گا سیلابِ بلا میرے بعد

سر بھڑنا وہ غالبِ شوریہ حال کا
 یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

نہ لانا صبح سے غالب کیا ہوا گراں لے سخت کی
 ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر

ہر گرفتارِ الفتِ صبا
 در نہ باقی ہے طاقت پر داز

دُحولِ دھپا اس سراپا ناز کا ثبوت نہیں
 ہم ہی کر بیٹھتے تھے غالب پیشِ دکن ایک دلی

تھم کے آتے آتے خطا اک اور کچھ رکھوں
 میں جانتا ہوں جو وہ نکھیں گے جواب میں
 مجھ تک کب ان کی بزم میں آیا تھا دویر جام
 ساقی نے کچھ ملا دیا ہو شراب میں

خدا شرابے باغوں کو رکھتے ہیں کشاکش میں
 کبھی میرے گریباں کو کبھی ہانوں کے دامن کو

رہے اس شوح سے آرزو ہم چہتے تکلف سے
 تکلف برطوت تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

یاز سے چھیڑ چل جائے اسد
 گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
 بس نہیں چلتا کہ چہر شہزادہ کی تاک میں ہے

(۱) اشار میں غزل کی روایت کا صحیح مزاج قناب ہے۔ یہ سب کے
 سب کا دوبار شوق کے آئینوں پہلوؤں کے ترجمان اور عکاس ہیں جن کو
 غزل کی روایت ایک مخصوص انداز میں پیش کرتی ہے۔ ان میں مجموعی
 طور پر ایک مخصوص فضا ہے جس کو غزل کی روایت ہر صورت اپنے

پیش نظر رکھتے ہے۔ ان میں کہیں عاشق کا دل گم ہوتا ہے کہیں
 ناصح اپنی نصیحت سے اس کے زخموں پر ٹھک چھڑکتا ہے لیکن
 اس کے باوجود عاشق محبوب کے کوچے میں جاتا ہے، اس کی
 دیوار کے سائے تلے بیٹتا ہے بلکہ اس سے سر پھڑکتا ہے۔ قیوں
 سے اس کی ٹوک جھونک رہتی ہے۔ فیروں کا وہ شکوہ کرتا ہے۔
 لیکن محبوب اس شکوے پر کان نہیں دھرتا۔ وہ غیر کی نینل میں سوتا
 ہے۔ عاشق اس کے در کے سائے بستر لگاتا ہے۔ پاسبان اس کو
 آڑے ہاتھوں دیتا ہے لیکن وہ توتیخ و گفن ہاندھ کر گھر سے نکلتا
 ہے تاکہ محبوب اس کو قتل کر دے۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری
 باتیں جو ان اشار میں بیان کی گئی ہیں ان میں غزل کی روایت کے
 اثرات صاف نمایاں ہیں۔ غالب نے اسی روایت کو اس طرح برتا
 ہے کہ ان کے یہاں صبح مسخوں میں تنزل کی شان پیدا ہو گئی ہے۔
 اور غالب اس اعتبار سے ایک بہت بڑے فن کار ہیں۔ انہوں
 نے ترقصوت اور فلسفہ کے موضوعات تک کو تنزل کے سانچے میں
 ڈھال دیا ہے۔ اور مشاہدہ حق کی گفتگو باوجود مسافریں بڑے
 سلیقے سے کی ہے۔ ان کے فن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ
 وہ اشعار اور کلاموں میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتے ہیں۔ دوز
 ایما کے پردے میں زندگی کے دقیق سے دقیق مسائل کو آسان
 بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تصوف کو تنزل کے
 رنگ میں پیش کرنے کی روایت فارسی اور اردو دونوں میں بہت
 پرانی ہے۔ اس لئے غالب نے اس کو بہت کر کوئی حدت پیدا نہیں

کی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اعلیٰ و ابلاغ میں بسنے نئے
 پہلو پیدا کئے۔ پرانی علامتوں میں نئی منویت کو سمویا اور نئی منویت
 کے لیے نئی علامتوں کی تخلیق بھی کی۔ اس طرح مجموعی طور پر انہوں
 نے فنون کی روایت کو ایک نیا اسلوب بھی دیا۔ یہ چند اشارے اس
 نئے اسلوب کے بہترین نمونے ہیں۔

۷۔ بقدرِ ظرف ہے ساقی غارِ تشنہ کامی بھی
 جو تودریائے مے ہے تو میں غیاث ہوں سائل کا

حرم نہیں ہے تو ہی نرا مائے راز کا
 یاں درز جو جلاب ہے پردہ ہے ساز کا

جہ از میں کو تھانائے ٹنگ کرتا ہے
 جو ہر آئینہ بھی چاہے بے ہر گان ہوتا

میں اور بزم سے سے یوں تشنہ کام آؤں
 گرمی نے کی تھی تو بہ ساق کو کیا ہوا ستا

دا کر دیے ہیں شوق نے بند نقابِ حسن
 غیر از تھکاء اب کوئی ماسک نہیں رہا

بجٹے ہے جلدء بکلی ذوق تماشا غالب
چشم کو چا بیٹے ہر رنگ میں دا ہو جانا

ہے تھیل تری سامان وجود
ذرتہ بے پر تو خورشید نہیں

جب وہ جہال و لغزو صحت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارتہ سوز پرے میں مز چھائے کون

ان اشعار میں جیسا کہ ان کے مضموم سے ظاہر ہے، نقصت کی باتیں ہیں۔ غالب نے ایک مخصوص اسلوب سے ان میں تغزل کی شان پیدا کر دی ہے لیکن غالب نے اس انداز و اسلوب میں جمالیاتی اظہار کر کے کوئی ایسی حدت نہیں کی جو غزل کی روایت کے خلاف ہو، کیونکہ تغزل کے اسلوب میں مسائل نقصت کو پیش کرنے کی روایت غزل میں بہت پرانی ہے۔ غالب سے قبل فارسی اور اردو دونوں میں اس روایت کو بڑے سلیقے سے پرتا گیا ہے۔ غالب نے اس روایت کو اپنے پیش نظر رکھا۔ البتہ اس کے جمالیاتی اظہار میں بعض حدتیں مزور کیں۔ مثلاً ”تمیازہ ہوں ساحل کا“۔ ”جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا“۔ ”جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مراں ہونا“۔ ”وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن“۔ ”بجٹے ہے جلدء لگی ذوق تماشا غالب“۔ ”ذرتہ بے پر تو خورشید نہیں“۔ جب وہ جہال و لغزو صحت مہر نیم روز“

ان سب میں ایسی بہت پائی جاتی ہے، جس سے غزل کی روایت اب تک ناہمیشناختی۔

میں ساری بحث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ غالب نے روایت کو بڑے سلیقے سے بُرا ہے اور حلیاتی انظار میں اس سے بڑے بڑے کام لئے ہیں لیکن روایت کو بعض ایسے پہلوؤں سے بھی بھنگا کر کیا ہے کہ اس میں بدلتی پیدا ہو گئی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے روایت کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا ہے اور اس کے بعض پہلوؤں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ مثلاً غزل کے بعض مضامین کے حلیاتی انظار کا روایتی انداز نہیں پسند نہیں ہے اس لئے ان کے کام میں جب یہ مضامین آتے ہیں تو ان کے یہاں شوخی اور طنز و مزاح کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غالب کو یہ انداز بھاتا نہیں۔ اس لئے وہ اس کو پیش کرنے میں طنز سے کام لے رہے ہیں۔ بلکہ اس روایتی انداز کا معنمو اٹھا رہے ہیں۔

غزل کی شاعری اس صحت کو برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ (جیسا کہ راقم نے آج سے چند سال قبل ایک مضمون میں لکھا تھا) سوز و گداز کی شاعری ہے اور شوخی کو گوارا نہیں کرتی۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس شوخی کو غزل کے لئے گوارا بنا دیا ہے اور وہ ان کی غزلوں کا ایک لازمی جز نظر آتی ہے۔ اس شوخی کا پتر ان کے یہاں حسن کے بیان میں بھی چلتا ہے۔ محبوب اور محبت کرنے والے کے جو رد و بدل ہیں اور ان کے نتیجے میں جو مسالات

پیدا ہوتے ہیں، ان میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ عشق اور
 کاروبار شوق کی جو تعینیں انسان نے پیش کی ہے اس میں بھی شوقی
 کا عنصر کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اس عشق کے جو نتائج نکلتے ہیں
 اور اس کا جو انجام ہوتا ہے، اس کی حقیقت میں بھی یہ شوقی اپنا
 اثر دکھاتی ہے۔ غرض غالب کسی جگہ بھی اس شوقی کو اپنے ہاتھ
 سے نہیں جانے دیتے۔ بلکہ اس سے خاطر خواہ کام لیتے ہیں۔ ہجرت
 کی بات یہ ہے کہ ان کے ایسا کرنے سے غزل کے کارگر بیشتر
 گری کو صیقل نہیں لگتی۔ یہ آگینے اس تندی صبا سے گھمتا نہیں۔
 اس کی آب و تاب پوری طرح باقی رہتی ہے۔ بلکہ اس میں جو
 شراب ہے اس کی مستی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور
 اس کے ظاہری رنگ میں کچھ اور بھی تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور
 ان دونوں چیزوں سے دل کو سرور اور آئینوں کو نور ملتا ہے۔
 لیکن غالب کے کلام میں یہ شوقی اسی جگہ اپنی انتہائی ہندوں پر
 نفاذ آتی ہے جب وہ فی کے روایتی انداز پر براہ راست یا باواسطہ
 طنز و مزاح کے تیر و نشتر چلاتے ہیں۔ یہ اشار ان کے فی کے اس
 دیکھائی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس سادگی پر کون زہر جانے اے حشدا
 روتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہے کیا جو گس کے باذیت یہ بھی پاؤں سے
 کیا جانتا نہیں ہوں تھادی لکر کو میں !

لاغزاشا ہوں کہ اگر تو بزم میں جاوے مجھے
میرا ذہن دیکھ کر اگر کوئی تجا دے مجھے

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تھی
سُن کے ستمِ ظریفین نے مجھ کو اشادیا کہ یوں

گدا کج کے وہ چپ تھا جو مری شامت آئی
اشاد اور آٹھ کے قدم میں نے پاہاں کے لئے

وہ جس قدر ذلت ہم بنی میں نہیں گئے
بارے آشتا ٹکلا اُن کا پاسباں اپنا

دل ہی تو ہے سیاست و دربان سے ڈر گیا
میں جاؤں اور وہ سے ترے ہیں صدائے کئے

دور پہ رہنے کو کہا اور کہ کے کیا پھر گیا
بتے غور سے میں مرا چٹا ہوا بسرِ گھٹا

مگر کھوتے کوئی اس کو خط تو ہم سے کھواتے
بہوئی صبح اور مگر سے کان پر لکھ کر تسلیم کھاتے

بوسہ دیتے نہیں اور دل چاہے ہر لحظہ نگاہ
 جی میں کہتے ہیں کہ مفت آنے تو مل اچھا ہے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
 آپ کی صورت تو دیکھ چاہتے

دن اشعار میں جو شریفی ہے۔ اس میں طنز و مزاح کا پہلو بہت نمایاں
 نظر آتا ہے۔ اور ان کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے
 غزل کے ان روایتی مضامین کو تنقید کی کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے۔
 بلکہ وہ ان کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔
 محبوب کا بیڑ تھوڑے دانا اور جیت کرنے والے کا اس کی اس سادگی
 پر مڑنا، محبوب کا کمر کو کس کے ہانڈھنا لیکن محبت کرنے والے کا اس
 سے نہ ڈرنا، محبت کرنے والے کا اتنا لاغر ہو جانا کہ کوئی اس کو دیکھ
 کر تباہ نہ سکے، محبوب کا محبت کرنے والے کو بزم سے اٹھا دینا، محبت
 کرنے والے کا محبوب کے کوچے میں جانا اور گدا گد کے پاسبان کا
 اس کو آٹھے دینا، سیاست و دربان سے دل کا ڈر جانا، محبوب
 کا محبت کرنے والے سے در پر رہنے کے لئے گناہ لیکن بستر کے کھینے
 ہی اس کا اپنے قول سے پھر جانا، محبت کرنے والے کا صبح کو
 کان پر قلم رکھ کر ٹھنکا تاکہ اسے خط لکھنے کا موقع ملے، محبوب کا
 بوسہ نہ دینا اور دل کو مفت کا مال سمجھ کر اس پر تلے دیکھ کر خیریدوں
 کو چاہنا لیکن اپنی صورت کی بے صورتی کو محسوس نہ کرنا، یہ تمام

مضامین ایسے ہیں جو غزل کے روایتی مضامین ہیں۔ غالب کو ان کی بے کیفی کا احساس ہے۔ وہ ان کو پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے انہوں نے طنز و مزاح کے رنگ میں ان کو پیش کیا ہے لیکن ان کے اس انداز نے ان کے فن میں ایک ایسا نیا پہلو پیدا کر دیا ہے جو اردو کے کسی دوسرے غزل گو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔

غرض روایت نے غالب کے فن میں کچھ ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جو غزل کے فن کی روایت میں اضافہ ہیں۔ اور جن کی وجہ سے غالب کا فن نئے آسمانوں پر پرواز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

غالب کے فنی میں جو پیرزب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے
 وہ علامتوں کا استعمال ہے۔ اُن کی شاعری علامتوں کا ایک ترقی ہے۔ انہوں نے
 اُن علامتوں کو نئی زندگی دی ہے۔ وہ علامتوں کی اہمیت کے قائل ہیں
 انہوں نے اس کا انحصار بھی کیا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ مشاہدہ حق کی گفتگو
 بادۂ وساخر میں امدناؤ غمرہ کی بات دشنہ و خنبر میں ہونی چاہئے تو
 گویا شاعری میں علامتوں کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔
 ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
 فنی نہیں ہے بادۂ وساخر کے بنیہ
 مقصد میں ناز و غمرہ دے گفتگو ہی کام
 چنا نہیں ہے دشنہ و خنبر کے بنیہ

لیکن غائب کے اس بیان میں علامتوں کو صرف انہماک و ابلاغ کا ایک ذریعہ اور وسیلہ بتایا گیا ہے۔ اُن کی جذباتی اہمیت کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ غالباً غائب اس کا شعور نہیں رکھتے تھے لیکن عملی طور پر انہوں نے اپنی شاعری میں علامتوں کو کسی مذہب کی ترمیمانی کے لئے استعمال کیا ہے اور اس میں اُن کی کوئی شعری کوشش شامل نہیں ہے۔ اُن کا جذباتی تجربہ ان علامتوں کو تینل کرتا ہے۔ یہ اہم بات ہے کہ وہ ان کے جالیاتی اظہار میں بھی حسن آفرینی کا باعث بنتے ہیں۔ غالب خود انہیں شعری طور پر اپنے حماسیاتی اظہار کے لئے تخلیق نہیں کرتے وہ قرآن کے تخلیقی مزاج کا ایک نظری عمل ہے۔ ڈبیرہ۔ بی۔ پیش نے شاعری کی علامتوں کی اہمیت پر شاید سب سے اچھی نظریاتی بحث کی ہے اور عملی طور پر بھی اپنی شاعری میں ان اصل اور نفوذات کو برتا ہے۔ بیش کا خیال ہے کہ علامتیں شاعری میں ایک بہت بڑی طاقت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے نہ صرف اس میں زور پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ اس کو پہلو وار بن کر اس میں حسن بھی پیدا کر دیتی ہے۔

علامتوں کا مطلب ہے تجربات کا اظہار اس طریقے سے کریں کہ اس سے بہتر اظہار ممکن نہ ہو سکے۔ ان علامتوں کے سہارے یقیناً شاعر کے پیچیدہ تجربات کا اظہار بہتر طریقے سے ممکن طور پر حسین پیرائے میں ہوتا ہے۔ یہ علامتیں کہیں کہیں شاعر کے جالیاتی اظہار کو کمزور مرد پر پیچیدہ بھی بنا دیتی ہے لیکن اس کی یہ پیچیدہ کیفیت نہ داری تک محدود رہتی ہے اس لئے اس میں احساسِ جمال کی

تسکین کا بڑا سامان ہوتا ہے۔

غائب نے بھی اپنے ہیچیدہ اور تہہ در تہہ تجربات کے اظہار کیلئے ملاسوں کو استعمال کیا ہے اور یہ علامتیں ان کے میاں ایک طاقت بن گئی ہیں۔ ان ملاسوں کی وجہ سے ان کے فن میں زندگی اور جوفانی نظر آتی ہے اور جالباتی اظہار کے لئے ایک نئے انداز کا تجربہ ہوتا ہے۔ اردو غزل کی روایت میں شاید غائب پہلے فن کار ہیں جن کے میاں ملاسوں کا استعمال ایک باقاعدہ نظام کی صورت میں ملتا ہے اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ پہلے باقاعدہ علامت نگار شاعر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مُردوبہ ملاسوں کو بھی استعمال کیا ہے اور ان کے جسم میں نیا حُزنِ زندگی دوڑا کر اُن سے بڑے بڑے کام لئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے بے شمار نئے ملاسوں کی تخلیق بھی کی ہے۔ ان نئے ملاسوں کی تخلیق میں اُن کی کسی شعور ہی کوشش کو دخل نہیں۔ ان کا وجود قر غائب کے تہہ دار اور ہیچیدہ تجربات کا سرچرچا بنت ہے۔

غزل کی روایت میں جو مُردوبہ علامتیں موجود ہیں اور جن کو غائب سے قبل نادرسی اور اردو غزل دونوں میں استعمال کیا گیا تھا، ان کو غائب نے بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے اور ان میں زندگی کی ایک نئی لہر بھی دوڑا دی ہے۔ نئے پہلو بھی ان میں نکالے ہیں اور کچھ نئے دسعتیں بھی ان میں پیدا کر دی ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے

دلِ گزرِ گامِ خیالی سے دِ ساعندہ جی سہی

گر نفسِ جادۂ سرِ منزلی تقدیٰ نہ ہوا

محبت تھی جن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
 کہ سوچے ہوئے لکڑی سے ناک میں آتے دم میرا

بغذِ غفلت ہے ساقیِ خوارِ تشنہ کامی بھی
 جو تو دور لیٹے ہے تو میں خمیازہ پہل ساہل کا

جلوہِ محفل نے کلامِ دواں چراغاں آبِ جو
 یاں رواں مژگانی چشمِ تڑے حزنِ ناب تھا

آج دواں تیغِ دکھنِ باندھے ہوئے جاتا ہوں
 غدر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کلامِ صبح نے ہم کو قید اچھپائی ہے
 یہ جزئیِ عشق کے انداز چھٹ جاتیں گے کیا

وہی اک بات ہے جریاں نفسِ دواں نکلتی گئی ہے
 جن کا جلوہ باعثِ شہ ہے مری رنگیں نرانی کا

دماغی مجھ کو نہ لے جاو نہ میرے حال پر
 ہر لگی تراکیبِ چشمِ خوشِ نشاں ہر جگہ کا

میں اور بزمِ نئے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی تو بے سالی ہو کر کیا ہوا تھا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر نکل خیالِ دہنم سے دامنِ قلاہ کا

شمع بجتی ہے تراکس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہ عشق سیاہ پوششِ بڑا میرے بعد

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
یہ خوشش ہوا ہے راہ کو پُر غار دیکھ کر

نہڑنا صبح سے غائب کیا ہوا گر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آئندہ زور چلتا ہے گریباں پر

اسہ سبیل ہے کس انداز کا قافلے نے کہا ہے :
کہ مشقِ نازکِ خونِ دو عالم میری گردن پر

ہوں گرفتارِ اُفتِ صیت و
ورنہ باقی ہے طاقتِ پڑاؤ

مُڑدے دے ذوقِ اسیری کہ نظر آتے ہے
دامِ خالی تھیں مرغِ گرفتار کے پاس

آبرو کیا خاک اس شخص کی کہ کشتن میں نہیں
ہے گریباں نکل پیراہن جو دامن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخواستِ تُلزمِ آشای مری
سوچے کی آج رگِ بیت کی مڑوں میں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خواب
سورگِ زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

مانعِ دشتِ زردی کرئی تدبیر نہیں
ایک چکڑے سے پاؤں میں زنجیر نہیں

محبوب کب اُسی کی بزم میں آتا تھا درِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پر وسعتِ مسلم
دشتِ ی ہے بے وہ ہمیشہ کہ گریباں نہیں

قصص میں مجھ سے رو دا نہیں کہتے : نور جہم
گر ہی ہے جن پہ کل بھی دو میرا پیشیاں کیوں ہو

خزاں کیا فصل کو کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم میں قصص ہے او۔ نام بال و پر کا ہے

کتا ہے کون نا زنبیل کو ہے اثر
پرے ہی غل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

اس انجی نازیکی کیا بات ہے غائب
ہم جی گئے اس اور تری تقدیر کو دئے

پہنلا تھا دام سخت قریب آئیاں کے
اٹنے نہ پائے تے کو گرفتار ہم ہوئے

ان اشار میں سے ہر ایک میں غزل کی کوئی نہ کوئی مردج
علامت استعمال ہوئی ہے لیکن ہر شعر کو پڑھتے ہی اس حقیقت
کا احساس ہوتا ہے کہ اس روایت کا استعمال صرف روایتی انداز میں نہیں
ہوا ہے بلکہ اس روایت کے استعمال نے ہر شعر میں نئی مصنوعی
دستوں کو سودا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ادبیاتی اظہار میں

بھی ایک رچی ہوئی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے۔

مندرجہ بالا اشار میں سے وساعر، ساقی، غارتشہ، کامی،

ہنرم سے، تھرم آتشی، مویج سے، دورِ جام، جلوہ گل، چمن، باغ

گلشن، بکمت گل، خزاں، قفس، صبا، سرخ گرفتار، رشت

نوروز، بلباں، زنجیر، بیل، آتیاں، شمس، انجمن، گریباں وغیرہ

کی جو بے شمار علامتیں استعمال ہوئی ہیں، وہ اس میں شبہ نہیں

کہ روایتی ہیں اور ندی اور اردو میں صدیوں سے رائج ہی ہیں

لیکن جس طرح غالب نے ان کو استعمال کر کے اپنی سانی و منہاسیم

کی وضاحت کی ہے اور جس انداز میں ان کے استعمال سے اپنے

فن میں حسن کی اقدار پیدا کی ہیں وہ روایتی نہیں ہے۔ اس میں

ایک جدت ہے۔ ایک اچھوتا ہی ہے اور اس جدت اور

اچھوتے پن کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ غالب ان علامتوں

اور اشاروں کو روایتی حدود میں قید نہیں رکھتے۔ بلکہ انہیں آزاد

چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ان میں معنوی اور فنی دونوں اعتبار

سے دستیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان میں کشادگی کے حتیٰ کا احساس

ہوتا ہے۔

غالب کے فن میں روایتی علامتوں اور اشاروں کے استعمال

کا جو نظام ہے، اس میں بھی کیسی کیسی ان سے ملتی جلتی بعض

نئی علامتیں وجود میں آجاتی ہیں۔ خلفہ گزراہ خیال سے وساعر

کے ساتھ جادہ، سر منزل تقویٰ، غارتشہ کامی کے ساتھ دریائے

سے اور خیانتہ ساحل، مویج سے کے ساتھ تھرم آتشی، جلوہ گل

کے ساتھ چراغاں، گل تر کے ساتھ چٹم خون فشان، پاؤں کے
 آبلوں کے ساتھ ماہ اور اس کی پُرخار کیفیت، ذوق اسیری کے
 ساتھ دام خالی و میزہ کی جو علامتیں اور اشارے ملتے ہیں، ان
 کی وجہ سے گستاخی کے اس حق میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا
 ہے جو ان کی روایتی علامتوں اور اشعار کی نمایاں خصوصیت ہے۔
 یہ صورت غائب کے فن میں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ
 وہ بنیادی طور پر علامتوں اور اشاروں کے شاعر ہیں اور اُن کی
 شاعری بے شمار علامتوں اور اشاروں سے آراستہ و پیراستہ نظر
 آتی ہے۔ ان علامتوں اور اشاروں میں سب سے زیادہ اہم وہ
 ہیں جن کی روایت اردو یا فارسی میں غائب سے قبل موجود نہیں
 تھی۔ غائب کے نئے احساس و شعور نے ان کو سب سے پہلے
 تخلیق کیا اور اپنی شاعرانہ کاری سے ان کے استعمال کو عمومی
 بنا دیا۔ مذکورہ ذیل اشارے میں نئی علامتوں اور اشاروں کا استعمال
 غائب کے فنی اجتہاد پر دلائل کرتا ہے۔

شب ہوئی پھر انجمنِ ریشندہ کا منظر کھلا
 اس مہکتے سے کو گو بابت کسے کا در کھلا
 گرچہ بون دیوانہ پر کیوں دستِ کماند کوب
 آستیں میں دشنہ چناں ہاتھ میں خنجر کھلا
 کہیں از میری ہے شبِ فتم ہے بلاں کا نزل
 آج ادھر ہی کو رہے گا دیدہ آخر کھلا

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاۃ آبگ ہے
خازنِ عاشقی مگر سازِ صدا سے آبِ ستا

خازنِ زادِ زلف ہی زنجیر سے جاکیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گبرائیں گے کیا

قید میں ہے ترے دخی کو وہی زلف کی یاد
اں کچھ اک رنجِ گراں باری زنجیر بھی ستا

بارغِ دشتِ زردی کوئی تدبیر نہیں
ایک پکڑ ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

رہزنی ہے کو دلِ رستانی ہے
سے کے دلی دلی تانِ روانہ ہوا

تھر بھلا جوڑ دوتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیا باں ہوتا

ہم تھے مرنے کو تھر سے پاس نہ آنا نہ ہی
آؤ اس شوق کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

آنے ہے بے کئی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا سے بد

چتا ہوں تھوڑی دور ہر اک دہر کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کسی روز تمہیں نہ تراش کئے عدد
کسی دن ہمارے سر پہ اُڑے پہلا کئے

فلت کوہ میں میرے شب غم کا ہوش ہے
اک شیخ ہے دیلِ بحر سے خوش ہے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمٹیاں کہاں
اُٹھے ہیں اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آدھِ فضیل کا رکاری ہے

کھتے رہے جہن کی حکایات غول چکان
ہر چند اس میں اتنا ہمارے قلم بہنے

ہر قدم دوری منزل ہے غایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاہاں مجھ سے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آئینا نش ہے
جہاں ہم ہیں دہاں دلو و رسن کی آئینا نش ہے

محبت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل
تا چند باغباتی صحر اکر سے کوئی

(۱) اشعار میں حوصلات و اشارات پائے جاتے ہیں وہ
اردو شاعری کے لئے بالکل نئے ہیں۔ مثلاً شب، انجم و شمشدہ،
دیوانہ، دشنہ و شہر، سیلاب، زنجیر، زنداں، رہزنی، بھر، بیاہاں
دشت، تیرنگش، تیز رو، رابہر، رہزنی، آرم، خواب سحر، غمت کوا
دلیل سحر، فضل لا لاسی، جہن، حکایات خوں چکاں، دوری منزل،
بیاہاں، دلو و رسن، باغباتی صحر و فیروز کی علامتیں اور اشارے ایسے ہیں
جی سے اردو شاعری غائب سے قبل نا آشنا تھی۔ غائب نے ان
کو اپنے گھر سے، وسیع، برگیر اور پیچیدہ تجربات کے انبار کا
ذریعہ اور وسیلہ بنایا۔ اس طرح ان کی تخلیق عمل میں آئی اور
انہی علامات و اشارات نے اردو شاعری میں نئی اعتبار سے ایک
انتساب پیدا کر دیا۔

سوال یہاں، پیدا ہوتا ہے کہ غائب نے پرانی علامتوں میں

نئی زندگی کیسے پیدا کی اور نئی علامتوں کو کیسے تخلیق کیا؟ دراصل بات یہ ہے کہ نقاب اپنی فنی روایت کی تنگ دامانی کے شکوہ سنج تھے۔ انہیں اپنے بیان کے لئے کچھ اور دستیں درکار تھیں اور ان کے جذبات پرچیدہ، خیالات وسیع اور افکار ہم گیر تھے۔ اس لئے ان کے تجربات کی تر و در تر کیفیت نے انہیں غیر شعوری طور پر ان علامتوں اور اشاروں کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ ان کا ہر تجربہ کسی نہ کسی علامت یا اشارے کی سمت میں اپنے آپ کو روٹا کرتا ہے۔ کہیں یہ علامتیں اور اشارے بہت واضح اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ کہیں ایک نقاب پوشی کے عالم میں انہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس عالم میں ان کے صحن میں کچھ زیادہ ہی نکھر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کچھ زیادہ ہی جاذبِ نظر دکھائی دیتا ہے۔

نقاب کی شاعری ان علامتوں اور اشاروں کا اجماع خاما نگار خانہ ہے۔ اس نگار خانے میں ان کے تخیل کی رنگین کاریوں نے نئے نئے رنگ بکھرے ہیں اور نژد کے طوفانِ اشائے ہیں چنانچہ مجموعی طور پر علامتوں اور اشاروں کے اس نگار خانے میں وہ صحن پیدا ہو گیا ہے جو ہر ایک وقت رنگیں اور پُر کار بھی ہے اور سلوہ اور ہلو دار بھی !

رُزِیۃُ اَوْرِ اِمّا یٰتے

غالبیے علامتوں اور اشاروں کے شاعر ہیں اور ان کی بس
 علامت ہندی نے بعض دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر ان کی شاعری
 میں رمزیت، ایمائیت اور اہام کے میلانات بھی پیدا کئے ہیں۔
 علامت ہندی کے ساتھ جن عوامل نے ان کی شاعری میں رمزیت
 ایمائیت اور اہام کے میلانات کو پیدا کیا ہے ان میں غالب
 کے احساس کی شدت، فکر کی ہندی، خیالات کی پیچیدگی، تقریبات
 کی گہرائی اور سماجیاتی انداز کے نئے سیار اور فن کی نئی اقدار
 بھی برابر کے شریک ہیں۔ غالب رمزیت، ایمائیت اور اہام
 کے ذریعے گہرے سے گہرے اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات کو
 فن کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ اس لئے رمزیت اور ایمائیت
 ان کے فن میں خوب سے مقصد نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سرائے

اور مراد کے ساتھ ان پہلوؤں کا باہمی رابطہ اور رشتہ ان میں عشق کی اقدار کو پیدا کر دیتا ہے اور احساسِ جمال کی تکیں کا باعث بنتا ہے۔

رمزیت اور ایمایت میں تو ہر فن کی بنیاد ہے لیکن شاعری اور خاص طور پر غزل کے فن میں اس کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کا بنیادی سبب تو یہی ہے کہ غزل ایک محدود صنف ہے۔ اس کا کینوس بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے باوجود وہ گہرے سے گہرے افکار و خیالات اور پیچیدہ سے پیچیدہ جذباتی تجربات کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے۔ اس لئے اس کو مجیدِ رمزیت اور ایمایت کا سارا نیا پڑا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غزل فنائی شاعری کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور شدید داخلیت پسندی اس کی بنیاد ہے۔ اس شدید داخلیت پسندی کی وجہ سے افکار اس میں کھل کر اور واضح طور پر نہیں ہو سکتا۔ غزل کے شاعر ہر دور میں رمزدایا کے پردے میں افکار و ابلاغ کرتے رہے ہیں اور انہوں نے اس رمزدایا کو غزل کے مزاج کا جز بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے فن کے ساتھ رمزدایا اور رمزدایا کے ساتھ غزل کے فن کا خیال آتا ہے۔

غالب نے اپنے فن میں رمزدایا کے اس ترجمان کو کچھ اور بھی آگے بڑھایا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ غزل کے صحیح مزاج جان تھے۔ اور اس کے فنی اصولوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ انہیں اس حقیقت کا علم تھا کہ غزل صرف رمزیت اور

ایمانیت ہی کے سہارے اپنے دامن میں دستیں پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے دمزیٹ اور ایمانیت سے کام لے کر اس صنف میں یہ دستیں پیدا کیں۔ غالب کے فلسفیانہ سلیڈن طبع اور اجتماعی شور نے انہیں اس کام کی طرف کچھ زیادہ ہی آمادہ کیا۔ فارسی اور اردو غزل کی روایت میں نقوت نے دمزیٹ اور ایمانیت کو پیدا کرنے کے سلسلے میں جو کارنامے نمایاں انجام دیئے تھے، ان کو انہوں نے اپنے لئے شیخِ راہ بنایا۔ چنانچہ انہوں نے مسائل نقوت کو دمزدایا کے پردے میں بیان کیا۔ اور مسائل نقوت سے بے ہونے حیات و کائنات کے مساوات کی فلسفیانہ تاویلی بھی دمزدایا کے پیرائے میں کی۔ اجتماعی شور سے کام لے کر انہوں نے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مساوات و مساکی کے مومنمات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی اور انفرادی رنگ کے پردے میں اجتماعی تجربات کی ترجمانی کی۔ ان حالات کی وجہ سے دمزیٹ اور ایمانیت کا رنگ آن کی شاعری میں کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا، اور اس نے ان کے فن میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ غالب کے کلام میں شروع سے آخر تک اس دمزدایا کی ایک لہری دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ مرن چند اشار ان کے اس فن سیلان کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں ۷

فنپر پھر لگا کھینے آج ہم نے انچامل
خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

ہوئے گل، نالہ دل، دودھ چراغ محفل
ہو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ہوئے سیر گل آئینہ بے مہرئی قاتل
کو اندازِ بھڑوں غلطیوں پہل پسند آیا

پھر تے کوپے کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ سگر یا و آیا

تو اور آرائشِ ختم کا کل !
میں اور اندیشہ ! تے دور وراں

نظر لگے نہ کہیں آن کے دست و ہاں دو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

دے کے خط سزا دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

اُن کے دیکھے سے جزا جاتی ہے مگر چہ رون
وہ کہتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

چکے چکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے مگر
بہس کے کرتا ہے بیان شوقی گفتارِ دوست

عاشقی مہر طلب اور تنہا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں غول بگر ہونے تک

رازِ مشق نہ رسوا ہو جاؤں
ورنہ مرنے سے کچھ بعید نہیں

تماشا کر اے عجزِ آئینہ داری
تجھے کس تنہا سے ہم دیکھتے ہیں

تماہ کے آتے آتے خطِ اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مئے عشرت کی خواہش ساقی گروں سے کس کیجئے
یہ بیٹھا ہے اک دو چار جامِ دہشتوں وہ بھی

ہماری سادگی تھی اقصائے ناز پر مرزا
تا آنا نہ تھا ظالم مگر متعبد جانے کی

حالا کہ ہے یہ بیلج خارا اسے لاد رنگ
فاضل کو میرے شیشے پرے کا لگان ہے

عسیر ہر چند کہ ہے برق خسر ام
دل کے غول کرنے کی فرست ہی ہی

گرچہ ہے طرزِ تافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جاتے ہے

افن اشار میں مختلف طریقوں سے رمز و ایما کی کیفیت کو
پیدا کیا گیا ہے۔ کہیں ان میں علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ کہیں
اشعاروں سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں سوز و غم کے بعض حصے چھوڑ
دیے گئے ہیں۔ کہیں خیال کو اوجھڑا دکھایا گیا ہے۔ کہیں ایسی
صورت پیدا کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کا حقیقی معنی ایسی چیزوں
کو پورا کرے جن کو جان کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہیں معنوں کے
بعض پہلوؤں کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے
کے لئے تجسس کی فضا پیدا ہو۔ غرض غالب نے اپنے بیشتر
اشار میں جو رمزیت اور ایمایت پیدا کی ہے اس میں ایک بات

نظام تھا ہے اور اس نظام کی تہ میں فضیلت اور مہارتی عوامل کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالب نے اس طرح رمزیت اور ایمائیت کو انسانی فطرت سے ہم آہنگ کیا ہے اور اس میں حسن و جمال کی ایسی اقدار پیدا کر دی ہیں جن کو انسان فطری طور پر اپنے احساس جمال کی نیکیوں کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ غالب کی رمزیت اور ایمائیت حیرت اور تجسس کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور پڑھنے والے میں غیر شعوری طور پر خود اعتمادی کا احساس پیدا کر کے کچھ حاصل کرنے کے جذبہ کو بھی بیدار کرتی ہے۔

غالب نے اپنے فن میں اس رمزیت اور ایمائیت سے بڑی پھولدار کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس میں پہلی سی چمک رہی ہے، متلیاں سی اڑ رہی ہیں اور جگنو سے جگمگا رہے ہیں۔

دفع تمام چیزوں کے حسن کی طرح غالب کے فن کی رمزیت اور ایمائیت کے حسن کو بھی مرن محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ رموز ایسا کے حسن کو پیدا کرنے میں غالب اپنا جواب نہیں دیکھتے۔ انہوں نے اس معاملے میں بڑی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مقامات ان کے فن میں ایسے بھی آتے ہیں جہاں توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور ان کی رمزیت اور ایمائیت پیچیدہ اور دوراز کار ہو کر ایسا

کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں اس کا سبب
ان میں ہوتا۔ بعض لوگوں نے اس کو غائب کے فن کا عیب
بنایا ہے لیکن بعضوں نے اس کو ان کے فن کی نمایاں ترین خصوصیت
قرار دے کر اس کو سراہنے کی کوشش کی ہے۔

غائب کے فن میں ابہام کا میدان بہت واضح ہے لیکن اس
میدان کو غائب کی شاعری کا عیب نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ابہام کا
میدان بعض خاص حالات کی وجہ سے ان کے فن میں پیدا ہوا ہے۔
اگر ان حالات کو سامنے رکھا جائے اور اس ابہام کے محرکات کا
سراغ مل جائے تو اس میں حسن کے بعض پہلو بھی نظر آنے
سکتے ہیں اور وہ ان کے فن اور ہایاتی انہار کا ایک اہم حصہ
معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس ابہام کے میدان کو پیدا کرنے میں غائب کی مخصوص افادہ
مجس ۱۰ ان کا مخصوص مزاج، ان کی مخصوص شخصیت، اس شخصیت پر
مبنی اہم غنیمتوں کے اثرات، ان کا مخصوص ماحول اور مخصوص حالات،
ان کے مخصوص افکار و خیالات، اور ان کے مخصوص فنی نظریات کا بڑا
بانتہ ہے۔ آنفاؤر طبع اور طبیعت کے اعتبار سے غائب مشکل
پند تھے۔ ان کے مزاج میں تن آسانی اور سہل نگاہی نہیں تھی۔
وہ شک کر بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش
میں سرگرداں رہنے میں انہیں کُلف آتا تھا۔ ان کی شخصیت نہایت
پہلوور تھی۔ اور وہ ہر بات میں پہلو نکالتے اور ہر چیز میں پہلو
پیدا کرتے تھے۔ ان پر ندری کے بعض مشکل پند شاعروں کا

اثر بہت گہرا تھا۔ خاص طور پر بیدل سے وہ بہت متاثر تھے۔ ان کے ماحول میں بھی مشکل بندی کا دور دورہ تھا۔ یاسی، ساشی اور تہذیبی انحطاط و زوال نے ہر شخص کو کسی نہ کسی اعتبار سے مشکل پسند موزور بنا دیا تھا۔ اس مشکل بندی سے درحقیقت وہ اس غلام کو بچہ کر رہے تھے جو انحطاط و زوال کے باوجود اس زمانے میں بعض ذہنی اور فکری تحریکوں کی وجہ سے زندگی کے ہمارے بھی موجود تھے۔ فکر کی گہرائی اور خیال کی رفت ماحول میں عام تھی۔ چنانچہ لوگ مہندی سے بات کرتا اور مسنا پسند کرتے تھے۔ ان حالات نے فن کے میاروں میں بھی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اب صرف سادگی اور صفائی ہی فن کا میار نہیں تھی، تہذیب داری کی کیفیت کے ساتھ ایک پیچ دار انداز بھی فن کا میار بن گیا تھا۔

یہ حالات تھے جن کی وجہ سے غائب کے فن میں ابہام کا سیلاب پیدا ہوا۔ اس میں ان کی کوئی شعوری کوشش شامل نہیں تھی۔ اس سیلاب کو تو ان کے فن میں پیدا ہونا ہی چاہئے تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ ایک روحانی مزاج فن کار تھے۔ روحانی فکارت کی بنیاد تحقیق کی بلند پروازی ہوتی ہے۔ اس تحقیق کے سہارے وہ ایسے مقامات تک پہنچتا ہے جہاں ہر شخص کا پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کے فن کی جہیوں کو جھوٹ نہیں کہتے۔ وہ بعض اوقات لام لوگوں کے لئے انہی ہو جاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ داؤد بنی خیال کو مستان طے نہیں

کر پاتے۔ ابہام کا قصور ایسے ہی مواقع پر رونما ہوتا ہے۔
 ہر برٹ ریڈ نے مسیح لکھا ہے کہ ابہام شاعر کے خیال نہیں ہوتا
 خود پڑھنے والوں کے ذہنوں میں ہوتا ہے۔ جب وہ شاعر کے
 پیچیدہ تجربات کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے اور اس کی پرواز کا
 ساتھ نہیں دے سکتے تو اس کے کام کو مبہم تصور کر لیتے ہیں۔

ویسے ابہام شاعری کے لیے بے ذات خود بھی کوئی انتہی اور
 نامائزس چیز نہیں ہے۔ ارسطو کے زمانے سے لے کر اس وقت
 تک شاعری کے نقادوں نے کسی نہ کسی زاویے سے شاعری میں
 ابہام کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ ولیم ایپسن نے
 اپنی کتاب (SEVEN TYPES OF AMBIGUITIES)

میں لکھا ہے کہ ابہام شاعری کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔
 وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کو شاعری کے لئے
 ناخوشگوار اور نامناسب بھی نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس خیال میں
 بڑی صداقت ہے کیونکہ شاعری کے بے شمار پہلو ایسے ہیں جن
 کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ خاص طور پر اس کا محض بہت
 بڑا دور ہوتا ہے۔ اس کو تو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ شاعری مسنی اعتبار سے بڑی
 چاروں چیز ہے۔ ایک معمولی سے شعر میں بھی کئی معنی ہوتے
 ہیں۔ آئی۔ اے۔ رچرڈز نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کسی
 نظم یا شعر میں مسنی کے چار پہلوؤں کو دیکھنا چاہئے۔ یعنی اس
 میں کیا محسوس کیا گیا ہے؟ شاعر کے شور کی کیا کیفیت ہے؟ اس

کی تر میں بنیادی مقصد کیا ہے اور شاعر کا اپنے پڑھنے والے کی طرف رتبہ کیا ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس طرح شاعری کے معنوی پہلو کو دیکھا جائے تو وہ خامی پیچیدہ چیز ہو جاتی ہے ۔ اسی لئے اس میں ابہام کا احساس ہوتا ہے ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کی معنویت بڑی متنوع وسیع اور ہم گیر ہوتی ہے ۔ اسی لئے فی ثلثے نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جو چیز بھی ہم گیر ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے ۔ شاعری پر یہ بات صادق آتی ہے ۔ وہ بھی ایک ہم گیر چیز ہے ۔ اس لئے اس میں بہت سی باتوں کو چھپا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اسی لئے ابہام اس کا لازمی جز بن جاتا ہے ۔

غالب کی شاعری میں جو ابہام ہے اس میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے ۔ تر در تر معنویت اس کی بنیاد ہے ۔ اس کی تیر و تھکیں پیچیدہ جذبات و احساسات ، گہرے افکار و خیالات اور ہایاتی اظہار کے چلو دار انداز کے اہتوں ہوتی ہے ۔ یہ اشارہ دیکھئے ۔

مری تیر میں ٹھہر ہے اک صورت خوابی کی
بیودہ برقِ خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

خمری میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چرخِ مردہ ہوا ہیں بے زباں گوہِ غریباں کا

کچھ نہ کی اپنے جُزبِ نارسا نے در نہ یں
ذرتہ ذرتہ روکشِ خورشیدِ عالمِ تاب ستا

دلِ تلک سے ٹپکتا وہ ہو کر بھرتہ تمنا
پیسے غم کچھ رہے ہو یہ اگر شرارِ ہوتا

جھائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیٰ کا

رہبرِ یک شیرازہٴ وحشت میں اجزائے بہار
سہرو بیگانہ ، صبا آوارہ ، گلِ نا آشنا

مغنیں برہم کرے ہے گنہگارِ خیال
میں درقِ گزشتہ نیرنگِ یک بتِ خانہ ہم

روشنِ ہستی ہے عشقِ خانہ و یلِ ساز سے
انہی بے شمع ہے گر برقِ غری میں نہیں

نغزائے غم کو ہی اسے دلِ نصیبت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

مانع دشت نوروی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ہے شوقِ نود سور پر ہر دھڑکبھر
یہاں کیا دھڑا ہے قطرہ و موج و جاب میں
ہے غیبِ غیب ہی کو سمجھتے ہیں ہم شہر و
پیشِ نظر ہے آئینہ دائمِ نقاب میں

ہیں زوالِ آمادہ احسنِ آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ رہ گزائرِ با ویاں

نشہ رنگ سے ہے دامنِ گل
مست کب بندِ متبِ بازو ہوتے ہیں
اہلِ تدبیر کی دامانِ گسیاں
آہوں پر بھی حفا بازو ہوتے ہیں

ہے آدمی بھائے خود اک مشربِ خیال
ہم انجمنِ کچھتے ہیں غوثِ ہی کیوں مذہب

غمِ دنیا سے گر پانی بھی زمتِ سرِ مٹانے کی
غلاب کا دیکھنا تھڑبِ ترے بار آنے کی

کھلے ہاکس طرح معنوں مرے مکتوب کا یارب
متم کائنات ہے اس کا فزنیہ کاغذ کے چلانے کی

ہے دبی ہستی ہر ذرہ کا خود مقرر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تہا آسماں سرخند ہے

کارِ گاہِ نبوت میں لالہ داغ سا مان ہے
برقِ خوشیِ راحتِ خونِ گرم و بہقان ہے

منہ سہا شگفتہ بزرگِ عافیت معلوم
باوجودِ دہلی خوابِ گل پریشاں ہے

ہر چند ہر اک شے میں تو ہے
پر تجھ ہی تو کوئی شے نہیں ہے

نہیں بہار کو فرصت نہ بہار تو ہے
طاوتِ چمن و خوبی ادا کہئے

دستِ میں شے نہیں کہ ان اشعار میں اہم ہے۔ یہ نیت
صاف اور سادہ نہیں ہیں۔ ان کی منویت پیچیدہ اور پہلو دار
ہے۔ غالب کے شمار میں نے اس قسم کے اشعار پر خوب خوب

خام فرسانی کی ہے اور ان سب کی شرح کو سامنے دکھا جائے
تو ان اشارے کے معنوم کی تہہ تک پہنچنا شاید اور بھی مشکل ہو۔
لیکن جو کہ ان لوگوں نے لکھا ہے اس سے کم از کم اتنا اذکار
مزدور ہو جاتا ہے کہ غالب معنوی اعتبار سے ایسے متزوج اور
ہیوادار اشارے بھی کر سکتے تھے۔ ان میں ابہام نہیں ہے۔
ابہام کا معنی ہے اور یہی ان کا فنی کارنامہ ہے۔

غالب نے اس ابہام کو ایک اسلوب بنا دیا ہے۔ اس
کو فنی کی صورت دے دی ہے اور اس فنی کو عجائباتی اعتبار سے
انتہائی جذبیوں پر پہنچا دیا ہے۔ انہیں خود بھی اس حقیقت کا
شدید احساس ہے۔ جب ہی تو انہوں نے اپنے اس اسلوب اور
فنی کے بارے میں اس قسم کے اشارے کیے ہیں۔
سہ زتائش کی تنہا ہے نہ جیسے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشد میں معنی نہ ہی

مشکل ہے زلیبس تمام میرا سے دل
میں سن کے اے سنی دران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

ہمارے شہر میں اب حرف دل لگی کے اسد
کھلا کر غامدہ حوض بہتر میں خاک نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخی کی ہیں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زبان نہیں

آگنی دامن شہیدان جن تقدہ چاہے بھائے
سد عافیتا ہے اپنے عالم تقریر کا

ہوں گرمی نشاۃِ تقدہ سے نذر سخی
میں مذہبِ لکشی تا آفریدہ ہوں

ان اشعار میں غائب کا یہ کہنا کہ انہیں نہ تائش کی تنہا ہے نہ
صلے کی پروا۔ اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اشعار میں معنی نہیں
ہیں تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا کلام مشکل ہے۔ بڑے
بڑے سمجھنے والے اس کو سن کر آسان کہنے کی فرمائش کرتے
ہیں۔ ان کے لئے بڑی مشکل ہے۔ کہیں تب مشکل نہ کہیں تب
مشکل۔ ان کے اشعار تو اب حرف دل لگی کے لئے رو گئے ہیں
اب ان پر یہ بات روشنی ہوئی ہے کہ ان کا کوئی کچھ نہ والا
نہیں۔ اس لئے طوہن بہتر بے کار ہے۔ وہ تو اپنے سخی کی داد
روح القدس سے پاتے ہیں حالانکہ وہ بھی ان کا ہم زبان نہیں

ہے۔ عقل خواہ کتنے ہی دامن بچائے لیکن ان کے خیال کو اس پر نہیں کر سکتے۔ ان کے عالمِ تقریر کا مدعا تو عیناً ہے۔ وہ تو گزشتہ نفاذِ عقد سے نفرت منج ہیں اور ان کی حیثیت تو ایک مذہبِ گھٹن نا آفریدہ کی ہے۔ اس حقیقت کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ انہیں اپنے فن کے بسمِ ہونے پر ناز تھا اور وہ اس کو اپنی ویسے، ہر گیر کو تہہ در تہہ مزیت کے اظہار و ابلاغ کے لیے مستحق اور فرضی خیال کرتے تھے۔

اور یہ ابہام بھی درحقیقت اس رمزیت اور ایمائیت ہی کا ایک اور روپ تھا جس کو بجایاتی اظہار اور فن کے لئے ہر دور میں مزدی قرار دیا گیا ہے۔

تصویر کاغذ اور پکی تراشی

غالب کی شاعری میں اُن کی تصویر کاری اور پیکر تراشی یا ایجبری
 میں خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔ اُن کا کلام ان تصویروں اور
 پیکروں کا ایک نگار خانہ ہے۔ ان تصویروں کے رنگ بڑے گرمے اور
 شوخ، میں۔ ان کے نقوش بڑے ہی نیکیے اور پہلو دار ہیں۔ یہ
 تصویریں سیدھی، سادی اور سہل نہیں ہیں۔ ان میں تو ایک طرح
 کا آجھار پایا جاتا ہے اور یہ آجھار زندگی اور جولان کی نشانی ہے۔
 یہ تصویریں چلتی چرتی، حرکت کرتی اور بولتی نظر آتی ہیں۔ غالب کا
 کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان بے جان تصویروں میں جان ڈال دی
 ہے اور ان تصویروں کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف نظر ہی کے لئے
 دل کشی کا سامان فراہم نہیں کرتیں۔ انسان کے تمام حواس کو متاثر کرنا
 ان کا شعار ہے۔

شاعری میں تصویروں اور پیکروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔
 بعض نقادوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ شاعری صرف ان تصویروں
 اور پیکروں کے مجموعے کا نام ہے جن کو الفاظ کے لباس میں نمایاں
 کیا جاتا ہے۔ یہ بات شاید پوری طرح صحیح نہ ہو کیونکہ شاعری
 صرف تصویروں اور پیکروں ہی کا نام نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بھی
 بہت کچھ ہے۔ اہمیت ان کے بغیر شاعری میں وہ بات پیدا نہیں
 ہو سکتی جس کی اس سے توقع کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو کے
 زمانے سے لے کر اس وقت تک شاعری کے مزاج داں ان
 تصویروں اور پیکروں کی اہمیت کے قائل رہے ہیں۔ اور اپنی
 اپنی تنقیدی اصطلاحوں میں انہوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز
 میں ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ان کی باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا
 ہے کہ شاعری ان تصویروں اور پیکروں کے سہارے زندگی سے
 زیادہ بھرپور ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی اس میں حجاباتی اعتبار سے
 رنگینی اور دفنائی کے چلو بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ شاعری میں تصویروں اور پیکروں
 کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کی گرفت اپنے موضوع
 پر بہت مضبوط ہے۔ اور جس چیز کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے اس
 نے اس کی شخصیت کا جڑ بن کر ایک سنگین تجربے کی صحت اختیار
 کی ہے اور اسی تجربے کے زیر اثر اس کے حجاباتی انہار نے
 مختلف تصویروں اور پیکروں کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ
 شاعر کے دانٹے ہوتے یہ پیکر اس کے فنی کو مؤثر بنانے میں

نمایاں کام کرتے ہیں۔ ان کا اثر پڑھنے والے یا سننے والے کے حواس پر ہوتا ہے اور وہ ان حواس کے تاروں کو چمڑ کر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک مبالغہ سرخوشی میں پہنچ جاتا ہے۔ اور یہی شاعری اور شاعرانہ فن کاری کی سراج ہے۔

ایک بند پایہ شاعر انہیں پیکروں اور تصویروں سے پہنچا جاتا ہے اور اس کے شاعرانہ فن کی اندازہ دانی اسی پیمانے سے کی جاتی ہے کہ اس نے کتنی جان دار، مؤثر اور دلکاویز تصویریں اور پیکروں کی تخلیق کی ہے۔ (ادرا پاؤنڈ نے لکھا ہے کہ ایک صحیح تصویر اور پیکر وہ ہے جو ایک لمحے میں شاعر کے جذباتی اور ذہنی تجربے کو پیش کرے۔ اسی صحت میں ان تصویروں اور پیکروں میں جان پڑ سکتی ہے، ورنہ تصویریں اور پیکروں کا پیش کرنا تو کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ ہر بات ایک تصویر کو سامنے لا کر کھڑا کر سکتی ہے اور ہر خیال ایک پیکر کو نمایاں کر سکتا ہے۔ پاؤنڈ نے اسی وجہ سے یہ لکھا ہے کہ شاعر اگر اپنی زندگی میں صرف ایک تصویر بنائے اور ایک پیکر تیار کرے تو اس کے لئے کافی ہے کیونکہ بے شمار بے جان پیکروں کا تراشا اور تصویروں کا جانا شاعر کے لئے کوئی قابل تریف بات نہیں۔

شاعری میں تصویریں اور پیکروں کے اثر کا دائرہ محدود

نہیں ہوتا۔ وہ تو پھیل کر بکراں ہو جاتا ہے کیونکہ وہ صرف مشاہدے ہی سے رشتہ نہیں جوڑتے بلکہ محسوسات سے تعلق

پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کا میدان بہت وسیع ہو جاتا ہے۔
 ہر ایک بات یہ بھی ہے کہ ان تصویروں اور پیکروں کی حیثیت
 ملائی بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے اثر سے بے شمار دوسری
 تصویروں کو بناتے اور پیکروں کو تراشتے ہیں اور اس طرح شاعری
 میں تصویروں اور پیکروں کا ایک مرتبہ سا تیار ہو جاتا ہے۔ بلکہ
 یہ کتنا زیادہ صحیح ہے کہ ایک نگار خانہ سا بن جاتا ہے۔

کورج نے اپنی تحریروں میں ان تصویروں اور پیکروں کی
 اہمیت کی وضاحت کی ہے اور شاعری کے فن میں ان کے مرتبہ
 کو متبہ کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ تصویریں ہر ذات خود
 چاہے کتنی ہی حسین اور دلآویز ہوں لیکن اس وقت تک مؤثر نہیں
 ہو سکتیں جب تک ان کے پیچھے شاعر کی ذہانت و لطافت اور اس
 کی کسی خاص کیفیت اور جذبے کا اثر نہ ہو۔ اور اس سے
 کورج کا مطلب یہ ہے کہ شاعری میں جو تصویریں بھی پیش کی جائیں
 اور جو پیکر بھی تراشے جائیں، ان میں شاعر کی شخصیت اور اس
 کے تجربے کا اثر ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس سے ان میں زندگی
 پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ان تصویروں اور پیکروں کے
 علاوہ دوسری اُن گنت ایسی تصویروں اور پیکروں کی تخلیق ہوتی
 ہے جو کسی نہ کسی طرح شاعر کے شاعرانہ تجربے سے
 ہوتا ہے۔

غالب نے اپنی شاعری میں جو تصویریں بنائی ہیں اور جو
 پیکر تراشے ہیں، ان میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کا

ذکر آؤپر ہوا ہے۔ غالب کی شاعری تصویروں اور پیکروں کا مترق بحر
 نگارخانہ ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کی مروجہ تصویروں اور پیکروں
 کو بھی اپنے شاعرانہ تجربات کے انداز کے لئے استعمال کیا ہے۔
 اور ان تجربات کی دستِ تنزیع اور بہرِ گیری کے پیشِ نظر بے شمار
 نئی تصویروں کو بتایا اور نئے پیکروں کو تراشا ہے۔ ان کے لئے
 موادِ آئندہ نے اپنی تدریج و تہذیب اور مخصوص حالات کے زیرِ
 اثر تشکیل پانے والی اپنی مخصوص ذہنی کیفیت سے حاصل کیا
 ہے۔ یہ تصویریں اور پیکر جو غالب کی شاعری میں ملتے ہیں، وہ
 اُن کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی حالات، اپنی سماعت اور اُن
 کے زیرِ اثر پرورش پانے والی ذہنی کیفیت کا آئینہ ہیں۔

یہ بات اس سے قبل بھی کہی جا چکی ہے کہ غالب ایک تہذیب
 کی پیداوار اور ایک تہذیبی روایت کے علم بردار ہیں۔ ان کی
 شخصیت پر اس تہذیب اور تہذیبی روایت کی گہری چھاپ نظر
 آتی ہے۔ غالب کا زمانہ اگرچہ اس تہذیب اور تہذیبی روایت کے
 انحطاط و زوال کا زمانہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ تہذیبی روایت
 غالب کے زمانے میں اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اس زمانے
 میں انحطاط و زوال کی کیفیت نے ایک عظمت کا احساس بھی افراد
 میں بڑھا دیا تھا۔ غالب کے یہاں بھی اس کا احساس غصیدہ ہے۔
 اور وہ صبحِ مسنون میں احساسِ عظمت کے اس رُعبان کی نمائندگی
 کرتے ہیں جو اس زمانے کے افراد میں موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ
 ترکی اور ایرانی تہذیبوں کی گہری ہوتی صورتِ متقی جس نے اس

برغیم میں ہندوستانی تہذیب کے ساتھ مل کر ایک نہایت ہی
 رستی ہوئی صحت اختیار کر لی تھی۔ غالب نے اسی تہذیب کی
 گود میں آنکھ کھولی اور اسی کے سائے میں اُن کی نشوونما ہوئی۔
 انہوں نے اسی تہذیب اور تہذیبی روایت کو اپنی دنیا بھا، اور
 اس کی ایک ایک چیز کو اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی۔
 یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں اس تہذیب
 اور تہذیبی روایت کے اثرات اتنے گہرے نظر آتے ہیں۔

غالب کی امیجری، تصویرکاری اور پیکر تراشی میں بھی اس
 تہذیبی روایت کا اثر مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے
 مثلاً اس تہذیبی روایت کی بنیادی خصوصیات یہ تھیں کہ انفراد
 محضیں سمجھتے تھے، ہزم ہائے عیش و نشاط کو آہستہ کرتے تھے۔
 مے و مینا کی باتیں کرتے تھے۔ جام چھلکاتے تھے اور مست ہو
 جاتے تھے۔ غالب کی شاعری میں یہ تصویریں اور پیکر بہت نمایاں
 نظر آتے ہیں۔ یہ اشارہ دیکھئے۔

دل گُذر گماؤ خیال مے و ساغر ہی ہی
 گر نفسِ ہادہٗ سر منزلِ تقدیٰ نہ ہوا

بلندِ عرف ہے ساقیِ تہارتشہٗ کامی بھی
 جو تو دیا تے مے ہے تو میں خیانتہ ہوں سائل کا

قلوۃ سے بس کو حیرت سے نفس پر دہرا
خطِ ہام سے سراسر رشتہ گویا ہوا

میں ادھ بزم سے سے یوں تشہ کام آؤں
گر میں نے کی سخی تو رہ ساقی کو کب ہواست

بے نئے کسے ہے طاقتِ آشوب آگئی
کیسنا ہے جز عود نے خطِ ایاض کا

ہم سے کھل جاؤ بروقت سے رہتی ایک دن
ادھ ہم چھڑی گئے دکھ کر غم نہ سنی ایک دن
زمین کی پیٹتے تھے سے لیکن بھٹتے تھے کہ ایاں
دنگ و نئے گی ہماری ناقہ سستی ایک دن

غالب چٹنی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیا ہوں روزِ اب و شبِ اسباب میں

جہاں فرا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں ہام آگیا
سب لیکریں ہاتھ کی گویا رنگِ جاں ہر گیش

جب یکدم چٹنا تو چسرا ب کیا بگ کی بند
سہد ہو دوسر ہو ، کوئی سنافتا ہو

مے سے عزم نشا ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی بچے دن رات چاہئے

نئے عشرت کی خواہش ساٹھ گروں سے کیا کیجئے
نئے بیٹا ہے اک در چار جام وڈ گوں وہ بھی

رندان در سے کہہ گستاخ ، میں ز اہد
ز خار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں کے

جا داو بادہ نوشی رندان ہے شش صحبت
خائف لگاں کرے ہے کہ گیتی خسراب ہے

شب کہ وہ مجلس فرد ز خلوت ناموس تھا
دشمن ہر شخ غاکبر ست نازس تھا

یاد میں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آریاں
لیکن اب نقش و نگار عاق نسیاں ہو گئیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے میز سے نئی
سُن کے ستمِ غریب نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس بزم میں مجھے نہیں بُنی سب کچھ
بیٹھا رہا اگر سب اشارے سے ہوا کچھ

اُس کی بزمِ اُراتیاں سُن کر دلِ رنجوریاں
مثلِ نقشِ بدعاتے میزِ میٹھا سب تھے

گرم ہے کس کس برائی سے دے با ایں ہر
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اے تازہ واردانِ باطن بولتے دل
زنگار اگر تھیں ہو کس نازِ کوشش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ حسرت نگاہ ہو
میری سوزِ کوششِ نصیحتِ نبوت ہے

ساقی بہ جلوہ دشنِ ایمان و آگہی !
مکروب بہ نغمہ بہزنِ تلکیں و ہوش ہے

یاسب کو دیکھتے تھے کہ ہرگز مشہ بہا
 دکانِ باغبان و کتبِ گلِ فروش ہے

لطفِ خرمِ ساقی و ذوقِ مدائے چنگ
 پر جنتِ نگاہ وہ فردسِ گلش ہے

واغِ ذاقِ محبتِ شب کی عسلِ ہون
 اک شمعِ رہ گئی ہے سودہ بھی غرض ہے

ہیوں شراب اگر خم بھی دیکھوں دو چار
 یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

ہے ہوا میں سحراب کی تاثیر
 بادِ نوشی ہے بادِ ہمیائی

گردِ خوشِ ساغرِ صدِ جلوۂ رنگیں بجائے
 آئینہ داری یک دیدۂ جہاں بجائے

ہلا دے ادکے ساقِ جوہر سے نفرت ہے
 پیالہ گر نہیں دیتا ز دے شراب تو جسے

وہ آیا ہر دم میں دیکھو نہ کیوں پھر کہ غافل تھے
 شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

کتنے ہوتے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
 ہے یوں کہ مجھے ورنہ ہر جام بہت ہے

انے اشار میں سے وساعز، قنور، سے، جام، سے، بے پرستی، بادہ
 جام، سے کہہ، بے خودی، ارندان، در، میکدہ، بادہ، نوشی، زندان،
 ہوس، ناز، ترش، تکلف، خرام، ساقی، خم، شیشہ، قدح، کوزہ، سہو
 گردش، ساغر، صد، جلوہ، رنگیں، پیالہ، شراب، ورنہ، جام، مجلس، رنگ
 ، بزم، آرائیاں، بزم، ناز، فصل، عرب، وادیں، باغیاں، کتب، گل
 فروش، اور، شیخ، وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں اور جو پیکر تراشے گئے
 ہیں، ان کا تعلق ایک تہذیب اور تہذیبی روایت سے ہے۔ لیکن غالب
 نے ان سب میں اپنے تجربات کا لہو اس طرح دوڑایا ہے کہ یہ
 تصویریں اور پیکر منہی اور فنی دونوں اعتبار سے محدود نظر نہیں
 آتے۔ برخلاف اس کے ان کے انفرادی تجربات نے ان میں وسعتیں
 پیدا کر دی ہیں۔ اور ان کے ساتھ اس تہذیب، معاشرت اور اس
 کے زیرِ سایہ پرورش پانے والے افراد کے ذہنی اور جذباتی نشیب و
 فراز کی اُن گنت تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ کہیں کہیں
 ان تصویروں میں علامتوں کا رنگ مزور نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں
 ہم ان تصویروں اور پیکروں کا تعلق ہے، وہیں رنگ ان میں کوئی

خاص کیفیت پیدا نہیں کرتا۔ ان میں تو جو کیفیت ہے وہ یہ ہے کہ یہ تصویریں بہ ذاتِ خود نہیں ہیں اور اپنے ساتھ بے شمار ایسی تصویریں کو پیدا کرتی ہیں جن سے ان کے سسے میں اضافہ ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے ان کے اثر کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جاتا ہے اور اس اثر میں شدت بھی خاصی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی بنائی ہوئی یہ تصویریں اور تراشے ہوئے یہ پیکر نئے نہیں ہیں۔ یہ عزلی کی روایت میں غالب سے قبل بھی موجود تھے۔ شاعروں نے ان سے کام بھی لیا تھا لیکن غالب سے قبل ان میں مرسودگی کے آثار نظر آتے تھے۔ غالب نے ان میں نئی زندگی پیدا کی اور کچھ ایسے رنگ بھرے جو خاصے گہرے اور تیز تھے۔ کچھ ایسے خطوط بنائے جو خاصے تیکھے اور پہلو دار تھے۔ مثلاً مے و ساغر، ساقی، بزمِ مے، مے پرستی، کثر، کامی و مینو سے جو تصویریں سامنے آتی ہیں وہ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ نہ جانے کتنی اور تصویریں کو پیدا کرتی ہیں۔ یہ تصویریں کہیں سیاسی اعتبار سے عروسی، عاشقانی اعتبار سے پامانی اور اخوتی اعتبار سے پس انداز کی تصویریں کو نمایاں کرتی ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ کچھ کرنے کی خواہش اور اس زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سنوارنے کی آرزو کی تصویریں بھی ان میں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ غالب کے تجربات کا تنوع ان تصویروں کو بنانا اور ان پیکروں کی تخلیق کرتا ہے۔

ان تصویریں اور پیکروں کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری میں

چمن ، باغ ، گل ، فتنہ ، خوشبو ، ہنر ، خزاں ، بہار ، باغیاں ، صحرا
 بیاباں ، دشت ، غار ، حذیب ، بیل وغیرہ کی تصویریں اور پکیر بھی
 اُبھرے جوتے نظر آتے ہیں۔ ان کو تخلیق کر کے بھی غالب نے ایک
 نئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ تصویریں بھی ظاہر ہے کہ نئی نہیں ہیں۔
 فارسی اور اردو شاعری کی روایت میں ان تصویروں اور پکیروں
 کی ایک باتاواہ جگہ ہے۔ لیکن غالب نے ان میں بھی اپنے تجربات
 کا جلوہ دکھا کر ان کی دنیا ہی بدل دی ہے اور اس طرح ان میں
 مسخری اور نئی دونوں اعتبار سے بے اندازہ وسعتیں پیدا کر دی ہیں۔
 یہ اشعار اس صوبہٴ حال کی وضاحت کرتے ہیں۔

فتنہ پھرنگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
 خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا !

بوتے گل ، تازہ دل ، دو دو سپہا رخ منگل
 جوتی بزم سے نکلا سو پریشاں بکلا

مے گئے خاک میں ہم داغِ نشانِ نشاد
 تو ہوا اور آپ بہ صد رنگ گھستیں ہونا

وہی اک بات ہے جو ایں نفسِ واں نکست گل ہے
 چمن کا جلوہ ہلٹ ہے مری رنگیں زانی کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشمِ خونِ فشاں ہو جائے گا

غمِ فراق میں تکلیف سیرِ گلِ مست دو
بجے دماغ نہیں خندہ اتنے بے جا کا

ربطِ یک خیرازہ دشت میں اجڑائے بہار
ہنوز بیگانہ صبا آوارہ گلِ نا آشنا

گر نہیں نکبتِ گلِ کوتاہے کہچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ روجِ لالِ صبا ہر صبا نا

بخشے ہے جلوہ گلِ ذوقِ مستِ شاداب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو صبا نا

خندہ نکستے ہیں بجے بادِ ببار سے
نیائے بے شراب و دل بے ہوائے گل

آہر کیا خاک اس گل کی جو ٹکشن میں نہیں
ہے گر کہاں تنگ پیرا میں جو دامن میں نہیں

سب کہاں کچھ لڑو گلّی میں نڈیاں برہمیں
خاک میں کیا صور میں ہوں گی کہ چنایاں برہمیں

یہ کس بہشت شنائی کی آمد آمد ہے
کو غیر جلوۂ گلّی رنگذر میں خاک نہیں

خزاں کیا ہا فصل گلّی کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور اتم ہال و پر کا ہے

غنچہ تاشگفتی ! برگِ عافیت معلوم
باد جوہِ دل جی خراب گلّی پریشاں ہے

پھر اس انداز سے ہمارا آئی
کو ہونے مسرور و مست شنائی

گلّش کو تری صحبت اذ میں کہ پسند آئی ہے
ہر گنچے کا گلّی ہونا آغوش کشائی ہے

آغوش گلّی کشودہ برائے دواغ ہے
اے عذیب ! چل کہ چھ دن ہمارے

چاک مَت کر جیب بے ایام گل
ہک اومد کا بھی اشارہ چاہئے

ہاں نشاط آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی ہے

نہیں بہار کو فرمت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خربتی ادا کیجئے!

اے مندیب یک کتبِ خسِ ہر آئیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

آمدِ بہار کی ہے جو بُلّ ہے نرسنج
اڑتی سی اک خیر ہے زبانی طیور کی

لختِ جگر ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
ہاچند باغبانیِ صرا کرے کوئی

دوڑے ہے پھر ہر ایک گلِ ولالہ پر خیال
حدِ گلستانِ نگار کا سامان کئے ہوتے

ان اشار میں غنچہ پھر ٹٹا بھلنے، برے گل، بھکت گل، چمن کا
جلوہ، باغ، گل تر، سرگل، سبز، بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا
جلوہ گل، باد بیدار، ہوائے گل، گلشن، لادو گل، غزن، فصل
گل، غنچہ تاشگفتی ۱۔ خواب گل، پھر اس انداز سے بہار
آئی۔ ہر غنچے کا گل ہونا، آفرش گل کشود، چلے دی بہار کے،
ایام گل، نشاط آمد فصل بہاری، طراوت چمن، طوفان آمد آمد
فصل بہار، آمد بہار کی ہے جو بیل ہے تندرست، شاخ گل، باغبانی
صحرا، صد گلستاں نگاہ کا سماں کئے ہوئے ویرہ کی جو تصویریں
غالب نے ہمیش کی ہیں، وہ اگرچہ روایت سے گرا تعلق رکھتی ہیں لیکن
اس میں انہوں نے اپنے تخیل سے نہایت گہرے اور شوق رنگ
بھر دیئے ہیں۔ اور اپنے احساس کی شدت، جذبے کی گہرائی اور
گل کی گیرائی سے جو نئی معنویت پیدا کر دی ہے، اس کی وجہ سے
ان کے تاثر کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے اور ان میں تقریباً
تمام محاسن کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ پھر
یہ تصویریں عبوی طرز پر اتنی رنگین اور پُرکار ہیں اور ان میں ایسی
رہی ہوئی کیفیت ہے جو اردو شاعری کی روایت میں کہیں اور
نظر نہیں آتی۔

غالب کی شاعری میں ان تصویروں اور پیکروں کو ان کے
گہرے تہذیبی اور معاشرتی شعور نے تخلیق کیا ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ اس تہذیب اور معاشرت کا پورا رچاؤ ان میں موجود ہے جس
نے غالب کو پیدا کیا ہے اور جس کے سائے میں ان کی شخصیت

کی نشوونما ہوئی تھی۔ لیکن غالب نے اس متذیب اور مسامحت کو ایک عالمِ انحطاط میں بھی دیکھا ہے۔ اس میں انہیں ندال کے آثار بھی نظر آتے ہیں اور ان کے احساس میں انحطاط و زوال کے یہ تاثرات اس طرح گھل جلی گئے ہیں کہ غالب کی تصویروں کی رنگینی اور رنگین کاری میں ایک کسک کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور اس کسک کی کیفیت نے ان کی امیجری میں عجوبی طور پر ایک تیز اور المیہ رنگ کو نمایاں کر دیا ہے اور اس رنگ کے اثرات ان کے یہاں اس قدر پھیلے اور بڑھے ہیں کہ ان کی نشاطیہ اور طریحہ نشاطیہ تک اس سے متاثر ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی نشاطیہ میں اس المیہ اور تیز رنگ کی ایک لہری دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس صوبتِ سال ہی کا یہ اثر ہے کہ غالب کی شامہری میں آگ اور خون اور آگ کے متعلقات کی تصویریں شاید سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ غالب نے اپنے اظہار و ابلاغ کے لئے ان دو چیزوں کا استعمال جتنی فراوانی سے کیا ہے، شاید اتنی فراوانی سے کسی اور چیز کا استعمال نہیں کیا۔ اس کا سبب درحقیقت یہی ہے کہ غالب نے آگ اور اس کے متعلقات کی تصویروں کے ذریعے سے اس آگ کو پیش کیا ہے جو نہ مرنے کے دل میں دلی ہوئی تھی بلکہ ان کے آس پاس اور گرد و پیش بھی بھڑک رہی تھی۔ اور خون کی تصویروں کے ذریعے اس دریاے خون کا نقشہ کھینچا ہے جو نہ مرنے کے دل میں موج زن تھا بلکہ ان کے آس پاس

اور گرد و پیش بھی جس کا ایک سند موج زنی تھا اور جس میں طوفان
 سے آٹھ رچے تھے۔ پہلے آگ، شعلہ، دھواں اور خاکستر وغیرہ
 کی تصویریں دیکھئے۔

بہن کو ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
 موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

دل مرا سو زباناں سے بے مہا باہل گیا
 آتش خاموشی کی مانند گویا جہل گیا

دل میں ذوق وصل دیا دیار ہم جاتی نہیں
 آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو ستا جہل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں درد غافل بار بار
 میری آوازیں سے بال عفتا جہل گیا

عزم کیجئے جو ہر اندیش کی گرمی کس
 کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ مرا جہل گیا

دل نہیں بچھڑے دکھا آدرز داغوں کی ہمار
 اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جہل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غائب کر دل
دیکھ کر طرہِ تپاک اہلِ ہنسِ جل گیا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے ذہرۂ ابر آب تھا
شلوۂ جوارِ ہر اک سلفِ گر داب تھا

فرش سے تما عرشِ واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمین سے آسمان ہمکِ سوختن کا باب تھا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ بہتی نئے بہتے
مہوں شمعِ کُشتہ در غورِ معطل نہیں رہا

شمعِ بجتی ہے تو اُس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہٴ عشقِ سیا پرشش ہوا میرے بعد

کیوں بھل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
مُلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتشِ پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
مرگم نارِ داسے شردِ بار دیکھ کر

جُلتا ہے دل کر کیوں زہم اک بار سبیل گئے
اسے نامتناہی نفسِ شعلہٗ بارِ حیف

یک نظر بیش نہیں فرصتِ مہتی غافل
گر مہتی بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غیمِ مہتی کا اسد کس سے ہو بزمِ مرگِ علاج
شیخِ ہر رنگ میں ملتا ہے عر ہونے تک

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گہرائے گا کیا
آگِ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

پٹنا پر نیاں میں شعلہٗ آتش کا آسان ہے
وے مشکل ہے حکمتِ دل میں سوزِ غم چھپانے کی

اس شیخ کی طرح سے جس کو کوئی بھادے
میں بھی بچلے ہر دھن میں ہوں داغِ نامت نامی

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھو دکھو ذکرِ بچھو
مذہرِ کرد مرے دل سے کہ اس میں آگِ دلی ہے

جی جیسے ذوقِ فنا کی ناستی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

اُگ سے پانی میں بجتے وقت اٹھتا ہے صدا
ہر کوئی دراندگی میں نالے سے ناچار ہے

رم کر خالم کو کیا بود چسراغ کشتہ ہے
بنین بیابار دنا بود چسراغ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے بے
ورنہ یاں بے رونقی سود چسراغ کشتہ ہے

ہم خیمِ خوابِ غاشی میں بھی نوا پر واز ہے
سرور تو کہوے کہ دو دستہ آواز ہے

دھندلے ہے اس منفی آتشِ نفس کو ہی
جس کی صدا ہو عبودۂ برقی منہ بجتے

عبودۂ زائرِ آتشِ دوزخ ہمارا دل کسی
قرۂ شہرِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سو نہ عیشم اے ہنسی اور ہے

آتش کہہ ہے سینہ مرا را زہناں سے
اے وائے اگر مریض اظہار میں آدے

لگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اتد
ہے چراغانِ غم و خاکِ گشتان مجھ سے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کر نکلتے نہ لگے اور بجھائے نہ بیٹے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ ذہن میں یہ ادا
کوئی تباہ کہ وہ شمعِ تند غم کیا ہے

سنن میں خامہ غالب کی آتش انسانی
یعنی ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

ان اشعار میں آگ ہی آگ ہے۔ کہیں یہ آگ عالمِ امیری میں
پاؤں کے نیچے آکر ایک عالمِ اضطراب اور بے چینی کی کیفیت کو
پیدا کرتی ہے کہیں اس کی وجہ سے علو نہ بنیر ہوئے آتشِ دیدہ کی

صورت اختیار کرتا ہے۔ کہیں وہ سونہ نہاں سے دل کو بے مہا
 جلاتی ہے۔ کہیں آتش خاموشی کی طرح دل کو جلانے کا عمل اس کے
 ہاتھوں نکل جاتا ہے۔ کہیں وہ گھر کو آگ لگاتی ہے اور ہر چیز کو
 جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ کہیں وہ آہ آتشیں سے بال صفت کو
 جلاتی ہے۔ کہیں وہ جوہر اندیشہ کی گرمی کا روپ اختیار کرتی ہے
 کہیں وحشت کے خیال سے صحران کو جلاتی ہے۔ کہیں اس کے اثر
 سے حلقہ گرداب تک شعلہ جوار بن جاتا ہے۔ کہیں وہ زمین سے
 آسمان تک سوختن کے باب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کہیں وہ
 نار ہائے شرر بار بن جاتی ہے۔ کہیں رقبہ شرر میں اس کا
 عکس نظر آتا ہے۔ کہیں وہ غصہ کو جلاتی ہے اور کہیں اس کو غصہ
 کشتہ بنا دیتی ہے۔ کہیں دل میں ایک شرر بن جاتی ہے۔ کہیں
 دل میں اپنے آپ کو دباتی ہے۔ کہیں نفس کو آتش بار بناتی ہے۔
 کہیں پانی میں اپنے آپ کو روٹنا کرتی ہے۔ کہیں سونہ غم ہائے
 نہانی کی وجہ سے سینے کو آتش کدہ بناتی ہے۔ کہیں بگم گرم سے
 چمکتی ہے۔ کہیں وہ عشق بن جاتی ہے اور کہیں غامہ غالب کی
 آتش فشاں کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ غرض اس طرح غالب کی
 شاعری میں آگ نے اُن گنت روپ اختیار کئے ہیں اور ان کے
 فن میں بسبب ایسی تصویروں کو تخلیق کیا ہے جو ان کی دہائی مزاجی
 کو ظاہر کرتی ہیں اور جن کی وجہ سے اُن کے فن میں گرمی اور
 روشنی کا احساس ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی شاعری میں آگ اور اس

کے تعلقات کی تصویریں ایک عالم اضطراب کی پیداوار ہیں اور مزاج کی بے پیمانی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس اضطراب اور بے چینی کا وجود ان ناسازگار حالات کے نتیجے میں ہوا ہے جن میں غالب نے زندگی بسر کی ہے لیکن ان کے ساتھ لگاؤ اور اُس ولولہ و شوق نے پیدا کیا ہے جو ان کے مزاج کا لازمی جز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آگ اور اس کے تعلقات ان کے یہاں ناسازگار حالات کی ترجمانی ہی نہیں کرتے، جن اور زندگی اور طاقت کی علامت بھی بن جاتے ہیں۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو وہ اس قسم کے شر نہ کہتے۔

نہ شعلے میں یہ کر شر نہ برق میں یہ ادا
کوئی بناؤ کہ وہ شوخ تشدد خو کیا ہے

موجود ہے اس منفی آتش نفس کو بھی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا بجے

غالب یہاں شعلے میں ایک کر شر اور برق میں ایک ادا دیکھتے ہیں اور اس کر شرے اور ادا کو محبوب شوخ و تشدد کی ادائیگی اور کر شر کے ساتھ ایک مناسبت پیدا کرتے ہیں۔ گویا ان دونوں چیزوں میں انہیں حسن نظر آتا ہے اور وہ ان میں زندگی محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح منفی آتش نفس کی تصویر انہوں نے بنائی ہے اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے حواس اپنی تسکین بلکہ تکمیل کے لئے اس آتش نفسی کی تقاضا کرتے ہیں جو ان کے خیال میں

ایک متنی کا طرہ امتیاز ہے ۔

غالب کی شاعری میں آگ کی تصویروں کے ساتھ ساتھ برق اور بھل وغیرہ کی جو تصویریں ملتی ہیں ان سے بھی یہ بات صریح ثابت ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں کو حسن اور زندگی اور طاقت کی علامت سمجھتے ہیں ۔ برق اور بھل کا تعلق بھی بہو مال کسی نہ کسی طرح آگ اور آتش سے منسوب ہے ۔ غالب کو ان کے ساتھ بھی ایک ذہنی مناسبت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ان کی تصویریں بھی جگہ جگہ ملتی ہیں ۔ یہ اشارہ دیکھئے ۔

مری تیر میں مغرب ہے اک صورتِ خوابی کی
ہیولا برقِ خوس کا بے خون گرم دہقان کا

سراپا رہی عشق و ناگزیرِ انستِ سستی
مہات برق کی کرتا ہوں اور انکی حاصل کا

شب کہ برق سوئے دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعورِ حواء ہر اک طلعۂ گر آب تھا

گرنی تھی ہم پر برقِ تھلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادِ عرف قدحِ خوار دیکھ کر

علم نہیں جوتا ہے آزاووں کو بیش ازیک نفس
برق سے کرتے ہیں روشنی شیخ نام منانہ ہم

رونی بہتی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انہیں بے شیخ ہے گر برق خرمن میں نہیں

نفس میں مجھ سے دواد وچیں کتے نہ ڈر بہدم
گری تھی جس پہ کل بھل وہ میرا آئیاں کیوں ہو

نہ شے میں یہ کر شر نہ برق میں یہ ادا
کوئی باد کہ وہ شوق مند خاکسب ہے

غائب کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے برق خرمن، برق کی عبادت
برق سو ذل، برق تھی، برق سے کرتے ہیں روشنی شیخ نام منانہ
ہم، انہیں بے شیخ ہے گر برق خرمن میں نہیں، گری تھی جس پہ
کل بھل، نہ شے میں یہ کر شر نہ برق میں یہ ادا ویزہ کی تصویر میں
صرف برق اور بھل ہی کی تصویریں نہیں بنائی ہیں ۱۰ اپنے تخیل کے
دنگوں سے لام لے کر کچھ اور تصویریں بھی بنائی ہیں جن کو تخیل کی
میلک ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

آگ، آتش، دھواں، شرر، برق اور بھل کی تصویریں اور
پیکروں کے ساتھ ساتھ غائب کی شاعری میں خون اور ہر دھیسہ کی

تصویریں اور پیکر بھی بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان تصویروں کے حواشی اور عکاسات بھی وہی ہیں جو آگ، آتش، برق اور بجلی وغیرہ کی تصویروں کے ہیں۔ غالب نے انسانی زندگی کی ایک ایک بات پر اپنے دل کو خون کیا ہے، اس کے ایک ایک پہلو پر وہ خون کے آنسو روتے ہیں، اس کے ایک ایک نشیب و فراز پر انہوں نے خون کے دریاؤں کو موجزن دیکھا ہے، اور اس کے ایک ایک انقلاب پر انہوں نے خود خون کے دریا بہا دیے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خون کی ایسی تصویر یا تصویر ان کے مزاج کا تجزیہ بن گئی ہے۔ اور وہ اس تصویر کو اپنے بعض اہم تجربات کی ترجمانی کے لئے استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ دیکھنے کو کیسے کیسے عجیب تجربات کو انہوں نے خون کی تصویریں بنا کر پیش کیا ہے۔

تتہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

دل تا پگر کے ساحل دریائے خون ہے اپنے
اس رنگند میں جلوہ لگی آگے گرد مست

خونخیزی میں نہاں خون گشتہ لاکھوں آسندئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری ہڑتوں کا

جلوہ لگی نے کیا تھا وہاں چراغاں آبِ جو
یاں رواں ہڑتوں کا چشم تر سے خونِ ناب تھا

ناگلا اس رنگ سے خونِ ناب ہٹکانے لگا
دلِ کرذوق کا ریشِ نازن سے لذتِ یاب تھا

ایک ایک قمر سے کا بجے دینا پڑا حساب
خونِ جگر و دیتِ مہرِ گمانِ یارِ صفا

رگِ رنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ بھمتا
چے عزمِ بکھر رہے ہو یہ اگر دشوار ہوتا

پنے نذرِ کرمِ تحفہ ہے شرمِ کارِ ساقی کا
جنوں غلطیہٴ صدرِ رنگ و عمریٰ پارِ ساقی کا

نہ لہرا جان کر بے جرمِ تاملِ تیری گردن پر
وہ مانندِ خونِ بے گناہ حقِ اشتہائی کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جاؤ نہ میرے حال پر
ہر نکلے تر ایک چشمِ خوں نشان ہو جائے گا

زخیم گردب گیا ہو نہ صحت
نام گر رک گیا روا نہ ہوا

بے خون دل بے چشم میں موجِ نگرِ غیر
یہے کہہ خواب ہے سے کے سوراخ کا

دردِ دل کھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
آنکھیاں نگار اپنی غامِ خوں چگیاں اپنا

مقتل کو کس نشاط سے چتا ہوں میں کہ ہے
پُر بگل خیالِ زخیم سے دامنِ نگاہ کا

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے آئو جائیں کب

خوں بے دل خاک میں احوالِ بٹاں پر مین
اُن کے ناخن ہوئے متاجِ حنا میرے ہند

ہے خونِ بگر ہوش میں دل کھل کے رہا
ہوتے جو کئی دید کا خونِ تابِ فشاں اور

اسد میں ہے کس انداز کا قابل سے کہتا ہے
کو مشقِ ہمار کو خونِ درِ عالم میری گردن پر

عاشقی میں طلب اور مست ہے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ بگر ہونے تک

منصف سے لے کر یہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوش کو دامن میں نہیں

میں اور صد ہزار نوائے بگرِ خواش
تو اور ایک وہ نہ شنید کہ کیا کہوں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری پھو ہڑہ گر خونِ چکاں نہ ہو

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ بگر کو دیکھتے رہیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ مجھوں گا کہ تھیں دوسرے دُعاں ہو گئیں

دعا کیسے کہاں کا عشق جب سر پہڑنا سہڑا
تو پھر اے نگدل تیرا ہی سگب آستان کیوں ہو

نہ اتنا بے بسی تیغ جفا پر ناز و سداؤ
مرے دیارے قیامی میں سے اک سوخِ خون وہ بھی

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھتے تھے سیرنگ کو دیکھنا شرمی بہانے کی

علائکہ ہے یہ سبیلِ غار سے لار رنگ
غافل کو میرے شیشے پر سے کا گان ہے

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خسروام
دل کے خوں کے کرنے کی زحمت ہی بھی

شق ہو گیا ہے سبز خوشا لذتِ فراق ہے
تکلیف پر وہ داری جسمِ سبک لگی

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آہِ نفسِ لار لاری ہے

کھتے رہے جڑوں کی حکایاتِ خون چکان
ہر چند اس میں اتنا ہمارے قلم ہوئے

چپک رہا ہے بدن پر سو سے پیرا ہی
ہاری جیب کو اب حاجتِ رنوکا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر ہو کیا ہے

نخشِ غمزہٗ خون ریز نہ پوچھ
دیکھ خوں تابہٗ منشانیِ سیری

ہے موجِ نلکا تلوتمِ خوں لاشیں ہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھتے کیا کیا مرے آگے

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے نگ
نہنہ دے لجے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

پھر بھر رہا ہے خامہ مژگان ہ خونِ دل
سانہ چمن طرازیِ داماں کئے جوئے

غالب نے ان اشعار میں اپنے متنوع تجربات کی ترہانی کی ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کا اظہار خون کے بیان سے ہوا ہے۔ ان میں سے بعض اشعار کا موضوع ہی خون ہے لیکن بعض ایسے ہیں جن کا موضوع خون نہیں ہے لیکن اظہار کے لئے خون کے تصور کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک شعر کسی نہ کسی زاویے سے خون کی تصویر کو پیش کرتا ہے۔ یہ خون کی تصویر احساس اور جذبے کی شدت اور فکر کی گہرائی اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کے گہرے شور کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور پڑھنے والے کے حواس پر براہِ راست آن کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن ان تصویروں کو پیش کرنے اور پیکروں کو تراشتے ہیں غالب کی کوئی شعری کوشش شامی نہیں ہے۔ ان کے مخصوص مزاج اور مخصوص امتدادِ طبع نے ان سے ان تصویروں کی تخلیق کرائی ہے۔

یہ تو غالب کے ایسے اشعار ہیں جن میں براہِ راست خون کی ادب یا تصویر اور پیکر ابھر کر سامنے آتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن میں بات تو خون کی نہیں ہے لیکن جن میں سے مجموعی طور پر خون کی تصویر مزور ابھرتی ہے اور کم و بیش وہی اثر کرتی ہے جو ایسے

اشعار کرتے ہیں جی میں براؤ راست خون کی تصویریں کُنیاں
 ہوتی ہیں۔ یہ اشعار اسی میلان کے ترجمان ہیں

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دست کا کھاتوں زرب
 آستیں میں کشتہ نہاں ماتہ میں خنجر کھٹکا

دوست غزالی میں میری سہی فراموشی گئے کیا
 ذمہ کے بڑھنے تلک ناخن نہ جھڑ آئیں گے کیا

آج داں تیغ و کفن ہاندھے ہوئے بہاتا ہوں میں
 مہذہ میرے قتل کرنے میں وہاب لائیں گے کیا

کوئی میرے دل سے ہچے تیرے تیر خیم کش کو
 یہ نقش کماں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ہم کہاں قسمت آزما نے حباتیں
 تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مہابا کیا ہے میں خامن ادھر دیکھ
 شہیدان نگہ کا خون بہا کیا

ان آجوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
 ہی خوش رہا ہے ماہ کو پُرخار دیکھ کر

میں اور صد ہزار نواسے سبگر خراش
 تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کس کہوں

نہز سے چیر سبز اگر دل نہ ہو دو نیم
 دل میں پھری بھجور بڑا گر غل چکاں نہ ہو

نہر گئے نہ کہیں اسی کے دست و بازو کو
 یہ لوگ کیوں برسے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
 تو پھر اسے شگدل تیرا ہی عجب آستان کیوں ہو

حالا کہ ہے یہ سیلی خار سے لاد رنگ
 فاضل کو میرے ٹیشے پہ سے کا گناں ہے

انہیں منظور اپنے زخموں کو دیکھ آتا تھا
 اُسے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بنانے کی

شق ہو گیا ہے سبز خوش لذت فراغ
تکلف پر وہ داری رخصت ہو گئی

چر سب کو دھونے لگا ناخن
اسد فصل لاد کاری ہے

ان اشعار میں آہستہ میں دھن پنہاں، اٹھ میں خبر کھٹا،
زخم کے بڑھنے تک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا، گند میرے قتل کرنے
میں وہ اب لائیں گے کیا، یہ غلط کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار
ہوتا، صد ہزار نواسے جگر خراش، خبر سے چر سینہ، دل میں
چھڑی چھو، یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں، جب سر
چھوڑنا سٹرا، سیلے خار سے لاد رنگ، اپنے زخموں کا دیکھ آنا،
شق ہو گیا ہے سینہ، دھیرہ کا جو بیان ہے اس میں کہیں نہ کہیں کسی نہ
کسی طرح خون کی تصویر مزور سامنے آتی ہے اور حواس پر وہی اثر
کرتی ہے جو خون کی تصویروں والے اشعار کرتے ہیں۔

غالب نے بعض بڑی دل کش اور دلآویز تصویروں اور پیکروں
کی تخلیق کیلیں اور تشبیہات و استعارات کے سہارے بھی کی ہے۔
عام طور پر تمبیہات اور تشبیہات و استعارات کو کام کا زیور سمجھا
جاتا ہے۔ لیکن غالب کی شاعری میں ان چیزوں کا یہ قصہ نہیں ہے۔
ان کے خیال میں تو ان کا مقصد اظہارِ حال و باخ ہے۔ چنانچہ وہ
اسی مقصد سے ان کو استعمال کرتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ

غالب نے اظہار و ابلاغ میں ان تعلیمات اور تہذیبیات و استعارات سے بڑا کام لیا ہے۔ تخیل نے ان میں بڑی زندگی اور جولانی پیدا کی ہے اور ساتھ ہی ان کو رنگین اور پُرکار بھی بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات اور تہذیبیات و استعارات میں احساسِ جمال کی تسکین کا بھی خاصا سامان موجود ہے۔

پتلے تعلیمات کو دیکھتے۔ یہ اشعار کیسے رنگین اور پُرکار ہیں اور کیسی جان دار اور زندگی سے بھرپور تصویروں اور پیکروں کو آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

تیئسے بنیہ مرزا سکا کو بکن اسد
سرگشتہ نثار رسوم و بنود صحت

ہم سخن میثے نے فراد کو شیریں سے کہا
جس طرح کار کسی میں ہو کمال اچھا ہے

شوق ہر رنگ رقیبِ سرو سامان نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عرواں نکلا

مر گیا صد نہ یک مجنبتِ لب سے غالب
ناخوانی سے حریفِ دم جیسے نہ نہوا

کب وہ کمزور کی خُدائی تھی
سببِ زندگی میں مرا بسببِ ہوا

میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسد
تنگ آٹھایا تھا کہ سسہ یاد آیا

گرنی تھی ہم پر برقِ تہلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادِ غربت قدحِ غوارِ دیکھ کر

سلطنتِ دستِ بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ ہمیشہ نہیں

قید میں یعقوب نے لی گونہِ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روڑن و دیوارِ زنداں ہو گئیں

ہشمت و مزدوریِ عشرتِ گہِ خرد کیا خوب
ہم کو تسنیم بکونائی بسرا دہنیں

سب رقیبوں سے ہوں غرض پرستانِ مہرے
ہے نہ بیخِ غرض کو محرابِ کنساں ہو گئیں

دستگاو و پردہ خوشبار مہنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل و شمشیر پا انداز ہے

بے مَرَد ہی گزشتہ ہے ہو گرج مر خضر
حضرت بھی کل کہیں گئے کہ ہم کیا کیا کیے

ہم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ بھی ہم سفر ہے

ہم سخن تیشے لے فراد کو مشرب سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قد و گیسو میں تیس و کو کہن کی آناش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دلورسن کی آناش ہے

اک کہیں ہے اور نگہ سیلان مرے نزدیک
اک بات ہے امہاز میٹھا مرے آگے

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کے رہنا کرے کوئی

ان اشعار میں تمثیلات کا استعمال محض روایتی انداز میں نہیں
 ہوا ہے اور یہ تمثیلات صرف ان تصویروں اور پیکروں ہی کو
 نمایاں نہیں کرتیں جن کو عام طور پر ہندی اور اردو غزل کی روایت
 میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ان میں قرآنِ تمام تصویروں اور پیکروں
 کے ساتھ غالب نے کچھ اور تصویروں اور پیکروں کو بھی اُجھارا ہے۔
 مثلاً کوکبن کی شالی تصویر ان اشعار میں نہیں اُبھرتی۔ غالب اس
 کی شالی تصویر کے بہائے ان تصویروں کو اُجھارتے ہیں کہ وہ غائب
 رسوم و قیود کا سرگشتہ تھا۔ اس لئے بنیر تیشے کے زمر سا۔
 لیکن پھر یہ تصویر ان کے سامنے آتی ہے کہ تیشہ ہی اس کے لئے
 سب کچھ تھا۔ تیشے ہی کی بدولت اسے شہر سے ہم کلام ہونے
 کی توفیق عطا ہوئی۔ اسی طرح قیس کے بیان میں قیس سے زیادہ
 شوق اور اس کی بے سرو سامانی یا اس سے ہمدردی کی تصویر
 زیادہ اُبھرتی ہے۔ کم و بیش یہی صورت ان اشعار کی ہے جن
 میں یعقوب، خضر، سکندر، سیکھان، ہڈست اور زینا وغیرہ کا
 ذکر ہے کہ ان میں ان کی مخصوص روایتی تصویروں کے علاوہ غالب
 بعض ایسی تصویروں اور پیکروں کو بھی اُجھارتے ہیں جن میں ان
 کے نئے احساس و شعور کا رنگ نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔
 کم و بیش یہی حال ان تصویروں اور پیکروں کا ہے جو غالب
 کی شاعری میں تشبیہات و استعارات کے وسیع سے پیدا ہوئی
 ہیں۔ ان میں بھی غالب اپنی شخصیت کے مخصوص رنگ و آہنگ
 کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں اور ان کے احساس و شعور کی رنگ آمیزی

ان میں نئے پہلوؤں کو پیدا کر کے نئی تصویریں کو اجاگر ہے۔
غالب کے تخیل کی بلندی اور بلند پروازی ان تصویریں میں نئے
نئے رنگ بھرتی ہے اور ان کے خطوط میں ٹیکہ پڑن پیدا کر کے
ان میں نئی زندگی دوڑاتی ہے۔

ان اشارے اس کا اندازہ ہو گا۔
نقش فریادی ہے کس کی شوقی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں سہی آتش زیر پا
موتے آتش دیدہ ہے علقہ مری زنجیر کا

دل مراسونہ نماں سے بے مہا با جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا سبب گیا

دل تا جگر کو حاصل دریائے خوں ہے اب
اس رنگدہر میں جلوہ گل آگے گرد تھا

رگوں تک سے پکتا وہ لہو کہ پھر زہمت
پسے غم کج رہے ہو وہ اگر شہدار ہوتا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ ترے جوتے نے
کرے جو پر تو غور شبید عالم کیسے نکال سکا

خوشی میں شہاں غول گشتہ داکمں آرزو میں ہیں
چراغِ مژدہ ہوں میں بے ذہاں گور غریباں سکا

ہنوز اک پر تو نقشِ خیالِ یاد باقی ہے
دلِ افسردہ گویا جبر ہے رشتہ کے لکھاں کا

ہمیں کہ جوشِ یاد سے غیبیہ اُکھل رہے
ہر گوشہ بسا د ہے خورشیدِ ہارِ سکا

شب ہوئی سپرِ انجمِ رخشندہ کا شکر کھلا
اس تکت سے کہ گویا بختِ کدے کا در کھلا

الاولیٰ نے دیئے اوراقِ لبِ گلِ بہارِ سکا
یادِ کارِ اولِ اکِ دیریں بے شرجہ مست سکا

کہا کہ دیرِ ان ہی دیرِ آنِ اپنے
دشتِ گرتو کھڑے کھڑے یادِ آج سکا

بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے لڑکی
ہات کرتے کہ میں لب تشہ لقتسیر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا تیرا رکا عالم
میں مستعد فتنہ عشر نہ ہوا مست

جاتا ہوں داغِ حسرت کبھی لپٹے ہوئے
میں شمع کشتہ درخوردِ محفل نہیں رہا

لوگوں کو ہے خود خیر جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نانا اور

نہ گئی فتنہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اک نظر ہمیش نہیں فرست ہتی غافل
گر مٹی ہزم ہے اک رقعہ شر ہوئے تک

غلم ہتی کا اسد کس سے ہر تیرے مرگِ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے عر ہوئے تک

برشگالی دید، عاشق ہے دکھا چاہئے
کھن کھی مانند گل سوجا ہے دیوار میں

جہلی تیرا نقشِ مستم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

جوتے غول آنکھوں سے بنے دو کہ جسے شامِ فراق
میں یہ کھوں گا کہ کشیں دو فرزاں ہو گئیں

یکس بہشتِ شاکی کی آمد آمد ہے
کہ غیرہِ خلوئے گل رہ گذر میں خاک نہیں

جب وہ جہلی و لغزوِ صورت مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ کوڑ پر سے ہی مز چھپائے کیوں

اُسی شے کی طرح سے جس کو کوئی بھاد سے
میں بھی جلے جوؤں میں ہوں داغِ غنا مٹا ہی

چشمِ خواہاں غامضی میں بھی فوا پر دانا ہے
سرور تو کہوے کہ دوہرِ شمسِ آواز ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دور بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بہاں کے کس سے ٹھنڈا جائے ہے

کارگاہِ مہستی میں لالہ داغِ سہان ہے
برقِ خرمیٰ راحتِ خونِ گرمِ دہقان ہے

بدوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دہل سہی
فرزِ شورِ قیامت کس کی آبِ دہل میں ہے

دیکھو تو دھڑبڑی اندازِ نقشِ پا :
سوجِ خوامِ یار بھی کیا گلِ کترِ غمی

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوئے غمِ مانے نہانی اور ہے

نماہی جیسے گر جائے دمِ کترِ لافز پر
مرے قسمت میں یوں تصویر ہے شبِ مانے بھراں کی

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بہاٹ
وامانِ باغِ بہاں و گنہ گارِ دوش ہے

تلف غلام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوشت ہے

نہ شے میں یہ کرشمہ نہ برقی میں یہ ادا
کوئی تباہِ کردہ شوخ تندرِ خاکِ سیاہ ہے

نہیں نگاہِ کوائف نہ ہو نگارِ تو ہے
روانیِ روش و مستی ادا کہتے

میں اشار جن بے شمار تصویروں کو پیش کر رہے ہیں وہ نہ
سے بول رہی ہے۔ یہ تصویریں نئی ہیں۔ ان میں نئی زندگی ہے۔ نیا
لوہے نئے رنگ ہیں۔ نئے خطوط ہیں، یہ سڑک ہیں، ان میں
نہ داری کی کیفیت ہے۔ یہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہیں۔ اور نہ
جانے کن کن زاویوں سے حواس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور یہ
سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ یہ غائب کے نئے احساس اور نئے
شور کی تخلیق ہیں۔ غائب نے ان کے ہر رنگ میں جلوۂ صد
رنگ پیدا کر دیا ہے۔

عزیز جلد تک تصویر کاری اور پیکر تراشی یا ایسے ہی کائنات
ہے غائب ایک چلو دار فن کار ہیں۔ انہوں نے جن تصویروں کی تخلیق
کی ہے ان میں بڑی زندگی ہے۔ وہ بڑی جان دار ہیں۔ ان میں
بولانی اور سماجی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ وہ چلتے پھرتے اور بولتے

مہرئی نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں میں یک رنگی نہیں بلکہ رنگا رنگی ہے۔ ان میں بڑا تنوع ہے۔ بڑی وسعت اور ہر گیری ہے۔ غالب کی شخصیت اور ان کے ماحول نے ان تصویروں کی تخلیق کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بڑی گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ گہرائی غالب کے انفرادی اور اجتماعی تجربات کے صحیح ہاماسیاتی اظہار کی مرہونِ منت ہے۔ غالب کے تخیل نے ان تصویروں کو رنگین اور چرکار بنانے میں بڑا کام کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسے رنگ بھرے ہیں جو مددِ درجہِ مہذب نظر آتے ہیں۔ ان تصویروں کا اثر براہِ راست کھاس پر ہوتا ہے اور ان میں انسان کے تمام حواس کو متاثر کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ غالب موسمات کے شاعر ہیں اور حسنیاتی کیفیت کے اثرات

ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں۔ یہ تصویریں اس حیاتی کیفیت میں خدّت پیدا کرتی ہیں اور اس طرح ان کے ماحول احساسِ جمال کی لکیر کا بڑا سامان پیدا ہوتا ہے۔

غالب کی شاعرانہ فن کاری میں جو رمنائی ہے اُس کی بنیاد ان کی یہی تصویر کاری، پیکر تراشی یا سمبھری ہے۔ وہ زندگی کے شاعر ہیں۔ اور اس زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کی ترجمانی ان کی شاعری کا خاص میدان ہے۔ اس ترجمانی کی بنیاد ان کا احساس اور شور ہے۔ اس احساس و شور کے ارتعاش ہی کا نام ان کی شاعری ہے۔ غالب نے اس ارتعاش کو ان بے شمار تصویروں اور پیکروں میں مجسم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور ان تصویروں اور

پیکروں کا ایک حسین نگارخانہ ہے۔ غالب نے ان تصویروں کا خام مواد اپنے نئی مسلات، آس پاس اور گرد و پیش کے حالات معاشرتی اور تہذیبی روایات، اور ذہنی و فکری ترقیات سے حاصل کیا ہے۔ اور اپنے تخیل سے خاطر خواہ کام لے کر ان تصویروں میں جان ڈال دی ہے جو ان کے تجربات کے اہتوں تیار ہوئی ہیں۔ سی ڈے یوکس نے لکھا ہے کہ ایک شاعر کسی بھی چیز کو سامنے رکھ کر حسیں سے حسیں تصویروں کی تخلیق کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ چیز اس کے تخیل کو پوری قوت سے حرکت میں لا کر اس سے خاطر خواہ کام لے سکے۔ غالب کی تصویر کاری پر یہ قول صادق آتا ہے۔ اُنہی نے زندگی کی معمولی چیزوں کو تصویروں اور پیکروں کا روپ دیا ہے۔ لیکن اپنے تخیل سے، جن کی ان کے پاس فراوانی تھی کام لے کر ان میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔

یہ تخیلی شاعری کے لئے ایک دولت بیش بہا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی طاقت ہے جو شاعری میں گرمی اور روشنی کو پیدا کرتی ہے۔ کورج نے اس کو شاعری کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اور اس پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔ غیلے کے خیال میں تخیل ایک دہوتا ہے جس کی پرستش برہمنوں کے لئے ضروری ہے۔ سی۔ ڈی۔ یوسی نے لکھا ہے کہ وہ صلاحیت جو شاعری میں تصویروں اور پیکروں کی تخلیق کرتی ہے اور ان کو دوسروں تک پہنچاتی ہے وہ شاعر کا تخیل ہے۔ غالب نے اس تخیل کو اپنی شاعرانہ فن کاری میں بڑے پلٹے سے استعمال کیا ہے۔ اور اس سے بڑے بڑے کام لئے

ہیں۔ خاص طور پر ان کی تصویر کاری اور امجری میں یہ تخیل نئے نئے زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ اس تخیل کے صبح اور شام کے مناسب استعمال ہی کا یہ اثر ہے کہ ان کی تصویروں میں شدت اور جہلائی کے عناصر اتنے نمایاں دکھائی دیتے ہیں اور اسی تخیل ہی کے اثر سے ان کی تصویروں اور پیکروں میں پڑھنے والوں کو تاثر کرنے کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جو بقول ڈیے یوس اعلیٰ درجے کی تصویر کاری اور بلند پایہ پیکر تراشی کے لئے ضروری ہیں۔

انٹے نے ایک جگہ اپنی تصویر کاری اور پیکر تراشی کے بارے میں لکھا ہے کہ شاعرانہ تصویریں اس کے یہاں تاثر کے نتیجے میں پیدا ہوئیں۔ لیکن وہ صرف تاثر ہی تک محدود ہو کر نہیں رہ گئیں۔ ان تاثرات نے اس کی ذات کے اندر سیکڑوں اتم کے دلچپ اختیار کئے۔ شفا جستانی، زندگی اور جہلائی سے بھرپور، جھنجھیلی اور خوب صورت، بے شمار رنگوں میں رنگے ہوئے اور ان تمام تاثرات کو تفصیل کی طاقت نے مختلف صورتوں میں پیش کیا۔ اور انہوں نے شاعرانہ تصویر کاری اور پیکر تراشی کی صورت اختیار کر لی۔

غالب کی تصویر کاری پر بھی گوئے گی یہ بات صادق آتی ہے۔ انکی تصویر کاری اور پیکر تراشی کا تخیل عمل میں کم و بیش اسی طرح جلدی رہا ہے اسی لئے جہانگیر تصویر کاری کا تعلق ہے وہ گوئے کے ہنرمند معلوم ہوتے ہیں اور ان دونوں میں بڑی حد تک ایک مماثلت پائی جاتی ہے۔

شاعری میں سارا کھیل زبان کا ہوتا ہے بلکہ کتنا زیادہ صحیح ہے کہ شاعری زبان ہی زبان ہے اور زبان کے سوا کچھ نہیں۔ زبان ہی سے شاعری میں تجربات انھار و ابلاغ کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ زبان ہی سے وزن و آہنگ، ترتیب اور موسیقیت کی تخلیق ہوتی ہے۔ زبان ہی سے علامتوں اور اشاروں کا وجود ہوتا ہے۔ زبان ہی ایسبیری یا تصویر کاری کو زندگی دیتی ہے۔ غرض شاعری میں زبان اُن گنت کام کرتی ہے اور اس میں بے شمار پہلو اس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور زبان الفاظ کے نظام کا نام ہے۔ الفاظ جب انسان کے کسی خاص تجربے کے تحت ایک مخصوص صورت اختیار کرتے ہیں تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ اس میں شہ نہیں کہ شاعری کی بنیاد جذبات و احساسات اور افکار و خیالات

ہیں ہی کو شاعر اپنے تجربات کی شکل میں پیش کرتا ہے ۔
لیکن یہ تجربات اسی وقت شاعری کہلاتے جانے کے قابل ہوتے
ہیں جب ان کا انحصار تمازہ ، مستغنیہ ، شاداب ، مُترنم اور ہیرے
کی طرح ترشی ہوئی زبان میں ہوتا ہے ۔

غالب کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے ۔ ان کے فن
میں زبان کو نمایاں مقام حاصل ہے ۔ وہ زبان کے ہند پائے نو کا ۔
ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے زبان کے استعمال کو
ایک فن بنا دیا ہے ۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جہاں جاتی اندر
کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ زندگی سے بھرپور ہے ۔ (۲۱)
میں بڑی بولانی ہے ۔ بڑی جدت اور تازگی ہے ۔ بڑی ہی شگفتگی
اور شادابی ہے ۔ بڑی ہی رنگینی اور پُرکاری ہے ۔ غالب نے
اس کو طرب بنایا ، سنوڑا اور نکھارا ہے اور اس میں شروع
سے آخر تک ایک ہیرے کی طرح ترشی ہوئی کیفیت پیدا کر دی
ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب نے زبان کی صنّاعی ہی
کو اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ صرف صنّاعی ان کے یہاں نہیں
ہے ۔ وہ اس کے قائل بھی نہیں ہیں ۔ اُن کی زبان تو ان کے
تخلیقی مزاج کی آئینہ دار ہے ۔ وہ ان کی شاعری کے مواد کے
ساتھ سنا بہت رکھتے ہیں ۔ وہ ان کے تجربات کے ساتھ پوری
طرح ہم آہنگ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رنگ و آہنگ
میں ان کی شخصیت اور مزاج کا عکس صاف نظر آتا ہے اور ان
کی طبیعت کی تخلیق کیفیت اپنی تمام جلوہ سائیدوں کے ساتھ

اس میں بے نقاب نظر آتی ہے۔

غالب نے زبان کو ایک نیا مزاج دیا ہے۔ اس کے استعمال میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب سے قبل جو زبان شاعری کے لئے استعمال ہوتی تھی وہ اس زمانے کے لحاظ سے تو مناسب تھی لیکن ان کے زمانے تک آتے آتے فن کے تقاضے مختلف ہو گئے تھے۔ چنانچہ زبان کے استعمال میں نمایاں تبدیلیاں ہو چکی تھیں اور ان تبدیلیوں کی وجہ سے ان میں ایک نیا مزاج پیدا ہو گیا تھا۔ اس نئے مزاج کو پیدا کرنے میں غالب کی شاعری اور فن کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور اس اعتبار سے ان کے فن کی حیثیت ایک ترجمان بلکہ ایک تحریک کی ہے۔

شاعری کی زبان کا جو انداز غالب سے قبل تھا۔ اس کی صحیح مانندگی ایک طرف تو میر اور سوتا کرتے ہیں اور دوسری طرف انشا، جبرأت اور مصحفی۔ یوں میر اور سوتا کی زبان بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے اور انشا، جبرأت اور مصحفی میں بھی، جہاں تک شاعری میں زبان کے استعمال کا تعلق ہے، خاصا اختلاف نظر آتا ہے لیکن یہ اختلافات حاصل محدود ہیں اور ان میں سے ہر ایک شاعر کی شاعرانہ انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو میر اور سوتا نے جو زبان شاعری کے لئے استعمال کی ہے اس میں ایک خاص مزاج ملتا ہے۔ اس میں سادگی اور سلاست ہے۔ ایک سیدھا سادہ انداز ہے۔

وہ ٹپٹے کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اس میں رنگینی اور
 چمکاری نسبتاً کم ہے۔ اس میں وہ رچاؤ بھی کم ہے جو کسی زبان
 میں وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ہندی زبان کے
 اثرات موجود ہیں۔ لیکن ہندی کے اثرات بھی اس میں کچھ کم
 نہیں ہیں۔ اور ان دونوں اثرات نے مل کر اس میں ایک چاشنی
 کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ برخلاف اس کے انشا اجرات اور مستثنیٰ
 کی استعمل کی ہوئی زبان میں نسبتاً زیادہ پرکاری ہے۔ اس
 میں سادگی اور سلاست کا رنگ زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اس میں ہندی
 کی روایت کے اثرات نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ اس میں کسی قدر
 صناعتی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس صناعتی میں زیادہ بانگدگی
 کا پتہ نہیں چلتا۔ برخلاف اس کے زبان کو بنانے اور سنوارنے کے
 مسائل میں کسی مددگار ایک طرح کی بے نیازی سی نظر آتی ہے۔
 ان میں انشا، اس میں شبہ نہیں، مگر زبان کے بہت بڑے مزاج دان
 تھے لیکن جن حالات میں سے ہو کر ان کی زندگی کا قافلہ گزرا
 انہوں نے ان کی اس مزاج دانی کو ایسے ماحولوں پر بھی ڈال
 دیا جو غیر جمیدگی بلکہ ابتذال کی منزل کی طرف دھکتے تھے۔ جرات
 کی ذہنی سطح ذرا نیچی تھی۔ اس لئے وہ شاعری کی زبان میں کوئی
 ایسا رجمان پیدا نہ کر سکے جو نئی، حالاتی یا مسانیاتی اعتبار سے
 قابل ذکر ہو۔ ان کی شاعری میں مسائل ہندی تھے۔ اسی لئے ان کی
 زبان میں بھی وہ رنگ و آہنگ نظر آتا ہے جو مسائل ہندی کے
 ساتھ مخصوص ہے۔ مسکنی بے شک، ان میں ایسے شاعر ہیں، جن

کے یہاں زبان کے سامنے ہیں زیادہ سنجیدگی اور ہمتا دہی کا احساس ہوتا ہے اور وہ زبان کو نیا رنگ و آہنگ دینے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان شاعروں کے اثر سے شاعری کی زبان ایک نئی صورت اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ شاعر غالب کے ہم عصر تھے۔ لیکن جس وقت ان کے فن کا شباب تھا، اس وقت غالب کا فن بچپن کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس لئے ان شاعروں نے شاعری کی زبان اور اس کے استعمال میں جو رجحانات پیدا کئے، وہ ہر صورت غالب کے پیش نظر رہے۔ اور کسی حد تک، شعری طور پر یا غیر شعری طور پر، انہوں نے زبان کی اس بدلتی ہوئی کیفیت کا اثر قبول کیا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ان کے خاص ہم عصروں میں سے ناسخ نے اصلاح زبان کی ایک تحریک چلا دی اور عمل طور پر شاعری کی زبان کو سوارنے اور نکھارنے کی کوشش کی اور اس کی ذک چلک کو درست کیا۔ یہ اور بات ہے کہ خیال، موضوع اور مواد سے رشتہ توڑ لینے کی وجہ سے زبان نے ان کے یہاں صرف مقامی کی صورت اختیار کر لی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بندش الفاظ اور بندش الفاظ نگوں کے جڑنے کے مترادف سمجھی گئی اور اس کو ایک مرتب ساز کا کام تصور کر لیا گیا۔

غالب اپنے زمانے کے ان رجحانات اور میلانات سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوئے۔ اس کا ایک بہت واضح ثبوت تو یہ ہے کہ ان کے فن پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب انہوں

نے تاسخ کا تتبع کیا ہے ، اور ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو تاسخ کے اشعار کے ساتھ مماثلت رکھتے ہیں ۔ میر کی اہمیت کا انہوں نے خود امتزاج کیا ہے اور انہیں دیکھنے کا استاد تسلیم کیا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان کے بنائے ہوئے راستے پر پوری طرح چل نہیں سکے ہیں کیونکہ ان کے مخصوص مزاج نے اپنے لئے نئے راستے بنائے ہیں ۔

اس فنی اور سانی پس منظر کو سامنے رکھے بغیر غائب کی زبان کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ شاعری کی زبان میں یہ میلانات اور مہجانات دراصل وہ سرچشمے تھے جن سے غائب نے اپنی شاعری کی زبان کا ہیولا تیار کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اثرات کسی نہ کسی زاویے سے ان کی استقامت کی جوتی زبان میں اپنی جگہ مندرج دکھاتے ہیں ۔

یہ اثرات اپنی اپنی جگہ اہم مزور ہیں اور غائب نے ان کی اہمیت کو تسلیم بھی کیا ہے ۔ لیکن فارسی زبان اور فارسی کی شعری روایت کے اثرات بھی ان کی زبان میں چمکے گھرے اور ہمہ گیر ہیں ۔ غائب کو فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا ۔ وہ فارسی کے بند پایہ شاعر تھے ۔ بلکہ اپنے آپ کو بنیادی طور پر فارسی ہی کا شاعر سمجھتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی شاعری کی روح اور اس کے نقش انے رنگ رنگ کو اگر دیکھنا ہو تو ان کی فارسی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ ان کی اردو شاعری کا عبور فارسی کے مقابلے میں بے رنگ ہے ۔

خامس ہیں تاکہ اپنی نقش ڈالتے رنگ رنگ
گھڑا زلمہ وہ آردو کہ بے رنگ میں است

غالب نے اس شعر کے پچھلے مصرعے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے اس سے تو اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں جس خیال کا اظہار ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ ان کا آردو کا محمود بے رنگ نہیں ہے۔ اس میں تو نقش ڈالتے رنگ رنگ کا ایک جلوہ مد رنگ ہے جو دلوں میں اپنی جگہ بناتا ہے اور محاسن پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتا ہے۔

غالب کے آردو کلام میں جو رنگینی اور رچاؤ ہے اور جس نے اس کو نقش ڈالتے رنگ رنگ کا جلوہ مد رنگ بنا دیا ہے وہ مذہبی زبان کی رنگینی اور رچاؤ کا مرکب ہی بنتا ہے۔ مذہبی زبان کے اثر سے ان کی زبان میں شیرینی اور عذات، رنگینی اور رضائی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے مذہبی کے اضافہ کو استعمال کر کے اور ان کی بے شمار ترکیبوں کو تراش کر اپنی زبان میں اس طرح کھپایا ہے کہ ان کی خاموشی کی زبان میں گونج بونٹے سے بکھے ہوئے اور جہی زار سے سکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ اشعار دیکھتے سہ

دل تما جگر کو ساحل دریائے خوں سے اب
اس رہ گزرد میں جلوہ کلی آگے گرد ستا

اجاب چارہ سازنی دشت نہ کر کے
زندانی میں بھی خیال بیابان فردوس

ہوائے سیرگی آئینہ ہے مہرئی ستا کی
کہ اندازہ ہوں غلطی نہ پہل پسند آیا

جراحت تھوڑی، الماس ارمان داغ بگر ہے یہ
مہلک باد اسد غزارِ جاں درد مند آیا

ہوں ترسے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کہیں
کوششِ رقت کش کیا ہم قسبی نہ ہوا

بیان کیا کیجئے بیداو کاوش ہائے شرک کا
کہ ہر اک قطرہ خون داز ہے قیسِ فریاں کا

رنگِ فکرتِ سج بہارِ نفاہ ہے
یہ وقت ہے شگفتگی اتنے تاز کا

تاج کاوشِ غم بہراں سہا است
سینہ کو تھا دھینک کر اتنے راز کا

جلوہ گل نے کیا ستا دیں چوٹاں آب جو
یاں رماں ہڑاں چشم ترے غولِ ناب تھا

نائلیں اس رنگ سے غولِ ناب ہکانے لگا
دل کو ذوقِ کاوشِ ناصح سے لذتِ یاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جہنِ نار سانسے وہ نہ یاں
ذوہ ذوہ روکشِ غورِ شیدِ عالمِ تاب تھا

اب میں ہوں اور ماتم یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ کشال دارِ صفا

گھبرا میں میری نش کو کھینچے پھر دیکھ میں
جاںِ عادۂ ہوائے سرِ رگزارِ مست

نزدِ شمس آئے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت آئے رنگین کا جلا کب

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی آئے صبا کب

باغ سگفتہ پیرا بسا دِ نشاطِ دل
اے ہمارے ٹکڑے کس کے داغ کا

ذرتہ ذرتہ ساغرِ سے خانہ نیزنگ ہے
گردشِ مہنوں پر پٹک اے یلِ آشنا

ربطِ یک شیرازہٴ وحشت میں اجڑاتے ہمارے
سبزہ بیگانہ، سب آوارہ گلِ ناہشنا

غافل ہو وہم تازہ خود آرا ہے درِ ذیاب
جے شازہٴ صبا نہیں طرۂ گیاہ کا

تو اور آرائشِ خیم کا کل
میں اور اندیشہ اے دورِ دراز

یک تقریش نہیں فرست بہتِ غافل
گرائی بزم ہے اک رقصِ شر ہوئے یک

منہیں بزمِ کرے ہے گنبدِ بازِ خیال
میں ورقِ گردانی نیزنگ یک بتِ نمانہ ہم

شربت کار و ہر شوق کے
ذوقِ نثارۂ مہال کہاں

روشنی ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں سازے
انہی بے شمع ہے گر برقِ غم میں نہیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزمِ آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نیاں ہو گئیں

گلِ خفاں اے نازِ سب کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری اے لئے

کس طرح کاٹے کوئی شب اے کارِ چنگال
ہے تو زکوۃِ اختہ شماری اے لئے

دشتِ گاہِ دیدۂ غمِ بارِ میزوں و کینا
یک بیاباں جو، گلِ فرسش پا انداز ہے

قنبرہ شامِ شگفتنِ بارِ گِ عانیت معلوم
بادِ جود و طہی خوابِ گلِ پریشان ہے

دیکھو تو دیندر بہتی انداز نقشِ پا
موجِ خرام یار بھی کیا لگی کمرِ حنّی

پھر کچھ اک دل کو بیتداری ہے
بیز جو یائے زخمِ کاری ہے

پھر سب کھو دئے لگا ناخ
آمدِ کسل لارِ کاری ہے

وہی سد رنگِ نارِ مسداتی
وہی مدِ گونہ اشکِ باری ہے

جنوں تمت کشِ تکیں نہ ہو گزاردانی کی
نمکِ پاشِ خراشِ دل ہے لذتِ زندگانی کی

ساقی بہ جلوہ دشنی ایمان و آگہی
مُکروب بہ نثرِ رہزنِ تکیں و پکشی ہے

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گونہ بسا
داانِ باغِ بید و کنبِ گلِ فردش ہے

لطف خرام ساقی و ذوقی مدائے چگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوشتی ہے

ابن اشعار میں دل تا بگر کر ساحل دریائے خون ہے اب ،
چارہ سازی وشت ، ذذاں میں بھی خیال بیاہاں نورد تھا ، ہوائے
سیرِ گل ، آئینہ بے مہرئی قاتل ، کہ اندازِ جنوں غلیظین بسل جرات
تھوڑا ، الماس ارغوان ، داغِ بگر ہے یہ ، منت کش کھانگ تسی ، ہیدا
کادش اے مرغان ، رنگِ شکست ، بے بدار نگارہ ، شگفتی گل
اے تازہ ، تاراجِ کادش غمِ جبران ، مرغانِ چشم تر ، ذوقِ کادش
تاغ ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب ، باجم یک شہرِ آرزو ، جانِ دادہ
مہائے سرِ بگڑا ، نوازش اے بے جا ، شکایت اے رنگیں ،
داغِ حطرِ پیرایہ ، غمِ آوارگی اے صبا ، بساطِ نشاطِ دلِ سلور
مے خانہِ نیرنگ ، گردشِ جنوں ، چھک اے میں آشنا ، ربط
یک شیرازہ وشت ، بے خانہ صبا ، آرائشِ غمِ کاکل ، اندیشہ اے
دور و دراز ، گرمیِ بزم ، رقصِ شرر ، ورقِ گردانیِ نیرنگ یک
بتِ خانہ ، فرست کار و ہر شوق ، ذوقِ نغارہِ جلال ، عشقِ خانہ و ایریں
ساز ، رنگِ رنگِ بزمِ آرائیں ، نقش و نگارِ طاقِ نیل ، گلِ نشانی
اے تازہ جلوہ ، شب اے سارِ برشکال ، نو کردہ اخترِ شامی
دستِ گاو ویدہ خون بارِ میزوں ، یک بیاہاں جوئے گل ، فرسخِ پا
انداز ، پنہر تا شگفتی ، دھڑبھی اندازِ نقشِ پا ، موجِ خرامِ یار
جوڑاے ز سہمِ کاری ، صد رنگِ تازہ فرسائی ، آہِ فصلِ کارِ کاری

صد گونہ اشک باری، جنوں تہمت کش نکلیں، نمک پاش خواہش دل
 روشن ایمان و آگہی، رہزن تکیوں و ہوش، دامان باغیاں و کتب گل فروش
 لطف خرام ساقی خفق صدائے چنگ، جنت نگاہ اور زردی گوش
 و غیرہ کی بر حسین اور دلاویز، رنگیں اور پُرکار ترکیبیں غالب نے
 تراشی ہیں، وہ ان کا ایک نئی کارنامہ ہیں۔ اُسود شاعری میں ایسی
 دل کش اور مہذب نظر ترکیبیں کسی اور شاعر کے یہاں نہیں مل سکتیں۔
 غالب ان ترکیبوں کو تراشنے میں صرف اس وجہ سے کامیاب
 ہوئے کہ وہ فارسی زبان پر پوری طرح مہتر کہتے تھے اور اس کا
 رنگ و آم جگ غالب کی شخصیت کا جز بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے
 کہ غالب کی تراشی ہوئی ان ترکیبوں میں ان کی کوئی شخصی کشش
 اور کارکش نظر نہیں آتی۔ اسی لئے ان میں شاعری کے عمل کا احساس
 نہیں ہوتا۔ وہ تو ان کے یہاں فطری انداز میں ایک تخلیقی عمل کے
 طور پر وجود اختیار کرتی ہیں اور ان کے ستر درتہ جذباتی تجربات
 اور رنگیں اور پُرکار افکار و خیالات کا مکمل اظہار و ابلاغ ان
 ترکیبوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

غالب نے فارسی کی ان بے شمار رنگیں اور پُرکار ترکیبوں کو
 تراش کر نہ صرف اظہار و ابلاغ کا حق ادا کیا ہے بلکہ جاہلیانِ اختیار
 نے بھی اپنی شاعری کی زبان کو حد درجہ رنگیں اور پُرکار بنا دیا
 ہے اور ساتھ ہی ان کی وجہ سے شاعری کی زبان میں نئے
 امکانات کے چراغ روشن ہوئے ہیں اور نئی دستوں کی خمیں
 درخشاں ہوئی ہیں۔ اور یہ غالب کا بہت بڑا نئی کارنامہ ہے۔ اس

میں مستحضر نہیں کر غالب نے اس کا تجربہ کیا لیکن ان کے زمانے ہی میں اس تجربے نے ایک روایت کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس روایت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ روایت اور اس روایت کے اثرات غالب کے بعد آنے والے اردو کے تقریباً تمام اہم شاعروں کے یہاں اپنا جادو جگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

غالب کی شاعری میں زبان کا استعمال ہمیشہ موضوع کی مناسبت سے ہوا ہے۔ فارسی زبان کے اثرات ان کی شاعری میں جو اتنے گہرے نظر آتے ہیں، اس کا جبب بھی یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع اور زبان کے درمیان ایک مناسبت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ فارسی ان کے مزاج میں رچی ہوئی تھی۔ اس لئے جب بھی انہوں نے اردو زبان کی تنگ دامانی کا احساس ہوا تو وہ اس میں دست کو پیدا کرنے کے لئے فارسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور جہاں تک غالب کی شاعری کے موضوعات کا تعلق ہے ان میں تنہا تھا، وسعت اور گہرائی تھی۔ وہ تمام انسانی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے کل اظہار و ابلاغ کے لئے فارسی کا سہارا لینا لازمی تھا کیونکہ اس سہارے کے بغیر خالص اردو ان موضوعات کے اظہار و ابلاغ کے قابل نہیں تھی۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غالب فارسی زبان کے جمالیاتی رنگ اور اس کے حسی آہنگ کے حامل تھے۔ انہیں اس بات کا احساس بھی خدیہ تھا کہ فارسی ایک غنیمت تہذیبی روایت کی طور پر ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے فن کا

جایاتی ڈھانچہ اسی زبان پر استوار کیا اور اپنی کوششوں سے ایک نئی زبان کی شاہکار مہمت متیر کر دی۔

موسیقی کی مناسبت سے زبان کو استعمال کرنے کے شعور ہی کا یہ اثر ہے کہ غالب کے بیان زندگی کے پیچیدہ، اہم اور گہرے مضامین فارسی کے سہارے ہی شاعری اور فن کا حقیقہ بنے ہیں۔ لیکن سید سے سامے مضامین کو غالب نے فارسی کے اثر کے بغیر سید کی سادی عام اردو میں بھی پیش کیا ہے اور اس طرح اس مناسبت کے باعث ان کے سید سے سامے اشعار بھی جایاتی اعتبار سے خامی ابھرتے ہیں۔ مگر چندان اشعار اس صورت حال کی وضاحت کے لئے کافی ہیں۔

دلِ نہیں معلوم کیسکے اس قدر رینی
ہم نے بار بار ڈھونڈا۔ تم نے بار بار پایا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قلم نہ نکلا تھا سوطان نکلا

گوز کھجور آس کی باتیں گوز پاؤں آس کا جید
پرہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پکر کھلا

منہ نہ کھلے پر ہے وہ عالم کو دیکھا ہی نہیں
 زُلف سے بڑھ کر نقاب اس شخ کے منہ پر کھلا

حق خبر گرم کو نقاب کے اڑی گئے پڑنے سے
 دیکھنے ہم بھی گئے تھے پستاشا نہ ہوا

جے خبر گرم اُن کے آنے کی
 آج ہی گھر میں بوریلا نہ ہوا

گھر ہارا جو نہ روتے بھی تو دیراں ہوتا
 بھر اگر بھر نہ ہوتا تو بسایاں ہوتا

ہوئی مُت کو نقاب فرگیا پر باد آتا ہے
 وہ ہر اک بات پر کٹنا کریوں ہوتا فکب ہوتا

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے !
 دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سی
 آخر اس شخ کے ترکش میں کوئی تیر ہی تھا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

آنے ہے بے کئی عشق پر رونا غالب
کس کے گھر جانے کا سیلاب بڑا میرے بعد

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ سال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

فرغیا پھوڑ کے سر غالب وحشی تو ہے
بٹینا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

منکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وہاں کہاں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پر لوگ
ہم کو بچنے کی بھی امید نہیں

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ دنام ہے
یہ جانتا اگر تو کثرتا نہ گھر کو میں

یوں ہی گزرتا رہا غالب تو اے اہل جلی
دیکھنا ان بستیوں کو تم کو ویران برعکس

آگ رہا ہے ورو دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاہاں میں ہیں اور گھر میں جا رہا آتی ہے

کوئی افسیدِ بزنس میں آتی
کوئی صورتِ نفس نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ بھلی
ورنہ کب بات کر نہیں آتی

میں بھی سننے میں زبان رکھتا ہوں
کاش پڑھو کہ مدح کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غائب
منت باہر آئے تو ہوا کی ہے

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

سہاں جیسے گرمی کہاں کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پرواں زبان کتنی ہے
وہ کہیں اور سُنتا کرے کوئی

(ف) اشار میں جو زبان استہلال کی گئی ہے، اُس میں غامبی سے کہیں زیادہ اُردو مواد سے کام لیا گیا ہے۔ غالب غامبی جیسے اور انداز میں بات کرنے کے عادی ہیں اور ان کی شاعری میں بلاشبہ اس لیے اور انداز کا پتہ بھاری ہے۔ لیکن خیال اور مواد کی نسبت سے جب بھی مزیت پیش آتی ہے تو وہ خالص اُردو اور اس کے ٹیٹھ جیسے میں بھی بات کرتے ہیں۔ سیرت قویہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ غالب اس خالص اُردو زبان کے انداز اور اس کے ٹیٹھ جیسے کو غزل کے مزاج کا جز بنا دیتے ہیں اور ان کی شاعری میں اس کے استہلال سے صرف غزل کے کارگر شیعری

کوٹیس نہیں گنتی۔

اور اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ غالب اردو زبان، اس کے مخصوص انداز، مادہ سے اور لہجے کو ان جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے استعمال کرتے ہیں جو غلامی زبان کے مخصوص انداز اور لہجے سے بالکل ہی طرح ظاہر نہیں ہو سکتا۔ شفا مندرجہ بالا اشعار میں شور مچایا، گونہ سبوں اس کی باتیں گونہ پاؤں اس کا جھید، پری پیکر کھلا، زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا، حق خبر گرم، آج ہی گھر میں بویا نہ ہوا، گھر بھرا جو نہ روتے ہیں تو دیرانی ہوتا، ہوئی مدت کو غالب مڑ گیا پر یاد آتا ہے۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا، ہم تھے میرنے کو کھڑے، لاگ ہو تو اس کو ہم جھیں ملاؤ، جب نہ ہو کچھ بھی تو دعوہ کھائی کیا۔ کوئی بھلا کہ ہم بتلا نہیں کیا، مڑ کھاتا ہوں، یہ جاننا اگر تو مانا نہ گھر کو میں۔ یوں ہی گر روتا رہا غالب آگ رہا ہے، صد دیوار پر سبز غالب، ہے کچھ ایسی ہی بات جو چھپ ہیں، مفت ہاتھ آئے تو کیا بڑا ہے۔ کب وہ شفا ہے کہانی میری پال بھیجی کڑی کھلا کا تیرا، بات پر ماں زبان گنتی ہے۔ وہ کہیں اور سنا کر سے کوئی، دویزہ کے فقروں، جھوں اور ترکیہوں میں اردو زبان اور اس کے خاص انداز اور لہجے کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ غالب نے اس کو اپنے موضوع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے اور اس مناسبت نے ان لفظوں، فقروں اور ترکیہوں کو بھی فزل کے مزاج کا بجز بنا دیا ہے جو فزل کی روایت کے ساتھ

کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتے۔

غالب اس اعتبار سے ایک استفادہ کار ہیں اور ان کے اس فنِ بزرگ نے صنفِ غزل کے لئے نئے نئے فنِ امکانات کے دروازے کھولے ہیں۔

فارسی اور آردو زبان کے اتصال بکر امتزاج نے غالب کے فن میں بعض ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جو شاید آردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ مثلاً اس امتزاج سے ان کی زبان میں وہ شیرینی اور سلاوت پیدا ہوئی ہے جو ایرانی اور ہندی تہذیبوں کے امتزاج کی نشانی ہے۔ غالب نے فارسی کی شیرینی کو ہندی کی گلوٹ کے ساتھ اس طرح ملا دیا ہے کہ ان کی زبان میں ایک لگا مبینہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے ایسے اشار میں وہ رنگینی اور رمنائی پیدا نہیں ہوتی جو فارسی زبان کے زیر اثر تھیں ہونے اشار میں ملتی ہے۔ فارسی زبان کے اثرات قرآن کے کلام کے آگے جھٹے میں زبان نفا آتے ہیں جن میں زندگی کے رنگیں پہلوؤں کا بیان ہوتا ہے۔ سن کی بھلاؤ روحانیت اور تخیل پسندی ہے لیکن زبان کی فارسی اور ہندی روایتیں کا امتزاج ان کے ایسے اشار میں نسبتاً زیادہ ملتا ہے جن میں انسانوں نے قلبی واردات کو پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گداز کی کیفیت ان میں زیادہ نمایاں ہے اور اسی اثر سے ان کے کلام کے ایک حصے میں وہ عکاسات اور گلوٹ پیدا ہو گئی ہے جو مناسبت شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ چند اشار اس میلان کے بہترین

ترجماں ہیں۔

دل میں ذوقِ دل دیا دیا تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا بیل گیا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا ٹکا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرادنگ زدو تھا

میں نے روکاوٹ غائب کو دگر نہ دیکھتے
اس کے بیل گرنے میں گڑھن کت سیلاب تھا

ہوئے ترکے ہم جو رسوا ہوئے کیوں ذوق دیا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مسزاد ہوتا

ہے ایک تیر جی میں دونوں چھوٹے پڑے ہی
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے بگڑ چھدا تھا

ہوتی ممت کہ غائب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

ماتِ ملک گردش میں ہیں سات آسمان
جو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرا ئیں کب

آنے ہے جے کسی عشق پر رونا غالب
بکس کے گھر جانے گا سلاب پلا میرے بعد

آہ کو چاہیے اک عمر اخر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

سنا کر فیتروں کا ہم ہمیں غالب
تماشا تے اہل کرم دیکھتے ہیں !

دام پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

رنج سے خوگر ہوا انسان آرمٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں جہ پر کہ آساں ہو گئیں

اُسی شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھاوے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناماں

آٹھ آتی تھی سالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

پھر اسی بے وقت پر مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

آہی سب تار وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی بسے جوتے

کیا بیاں کر کے مراد نہیں گئے یار
مگر آشفۂ بیانی میری

چاہئے کو تیرے کیا سمجھا ست دل
باسے اب اس سے بھی کہا جائیے

میں جلتا تر ہوں اس کو مگر اسے جذبہ دل
اس پر ہی جائے پکار ایسی کہ پائے نہ بے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

انہ اشعار کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی فصاحت ہے۔
ان کی بنیاد سوز و گداز ہے۔ اس سوز و گداز نے ان اشعار میں
ملاقات احمد گھلاٹ کو پیدا کر دیا ہے۔ غالب نے ان اشعار

میں جو زبان استعمال کی ہے ، اس میں فارسی کے اثر کے ساتھ اردو زبان کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے عین اور متوازن امتزاج ہی نے سوز و گداز کی اس کیفیت میں شدت پیدا کر کے ان کو ملاوت اور گملاوت سے ہلکار کیا ہے۔

فارسی اور اردو زبان کی روایتوں کا یہ امتزاج بھی غالب کا ایک فنی کارنامہ ہے اور اس نے ان کے فن میں حواس کو متاثر کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم پیدا کر دی ہے۔

غالب کے فن میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس میں الفاظ کا صوتی آہنگ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے الفاظ کے مخصوص دروبست سے بگڑ بگڑ اپنے فن میں وہ موسیقیت اور نغمگی پیدا کر دی ہے جو پڑھنے اور سننے والوں دونوں کے حواس پر براہ راست اثر کرتی ہے۔ غالب کے یہاں مختلف الفاظ کو بلا کر ایک مترنم کیفیت کو پیدا کرنے کا بڑا سلیقہ ہے۔ یوں تو وہ منفرد الفاظ کی نغمگی اور موسیقیت کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں اور انہوں نے تجسرات کے اظہار کے لئے موضوع کی مناسبت سے ان الفاظ کے انتخاب میں بھی بڑے فنی کارنامہ شعور کا اظہار کیا ہے لیکن

حُفّتِ اناؤ کی محفّصں دروہست سے جو ننگی اور موسیقیت
 پیدا ہو سکتی ہے۔ اس میں غالب اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہی وجہ
 ہے کہ ان کے بیشتر اشار میں مرکبِ اناؤ کے محفّصں استمال کی
 وجہ سے پیدا ہونے والی موسیقیت اور ننگی کا کمال نظر آتا
 ہے۔ یہ چند اشار اشار دیکھئے۔

دل میں ذوقِ دہل و یادِ یار تک باقی نہیں
 آگِ اِس گھر کو لگی ایسی کہ جو متا جل گیا

دل تا چگر کہ ساحلِ دریا سے خوں ہے اب
 اِس رگِ زہر میں عبودہ لگی آگے گرد متا

احبابِ چارہ سازِ زحمتِ نہ کر سکے
 دُندان میں بھی خیالِ بیاہاں خود متا

ہوائے سیرِ گل آئینہ ہے مہرِ قاتل
 کہ اندازِ سخنِ غلطیدنِ بے لپسند آیا

غموں میں نہیں خوں گشتہ لکھوں آئندہ نہیں
 چراغِ مَرودہ ہوں میں بے زبان کوہِ غمِ بیاں کا

نہیں معلوم کیسی کس کا لہو پانی بہا ہوا
نکامت ہے سرشک آلودہ ہوتا تیری ہر گھٹک کا

دلِ شکستہ بے سجدہ نثار ہے
یہ وقت ہے ٹھنکتی گل آئے تاز کا

ہیں میں کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشہ بساط ہے سرشیشہ باز کا

تاراجِ کادش، خمِ بھراں بہا اسد
سینہ کرتا دھیند گہرائے راز کا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں قریب
آستین میں دشنہ پنہاں ماتہ میں شجرِ کھلا

داں کرم کو عذیرِ بارش مت غماں گیرِ غلام
مگر یہ سے یاں چہ باز کتبِ نیلاب تھا

بہر گل نے کیا تھا داں چہ سراغاں آب جو
ہاں رواں ہر گاہی چشمِ رے غلوں تاب تھا

ناگماں اِس رنگ سے خونِ نابِ ٹپکانے لگا
دل کو ذوقِ کاوشِ نازی سے لذتِ یاب تھا

مانہ زاوِ زلف ہیں زنجیرے جالیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زلفاں سے گہرائیں گے کیا

فرازشِ آتے بے جا دیکھتا ہوں
شکایتِ آتے رنگیں کا گلا کب

استہم وہ مجنوں جیساں گدلتے بے سرو پا میں
کہ ہے سرِ پنجرہٴ ہر گمانِ ابرِ پشتِ خار اچھا

باغ میں مجھ کو نرے وردہ میرے حال پر
ہر گلِ ترا یکِ سپہمِ خوںِ نشانِ ہو جانے کا

سید میں ہے ترے دُشمن کو وہی زلف کی یاد
اُن کچھ اک رنجِ گراں باری نہ بغیر بھی تھا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ بہتی پیٹے ہوئے
ہوں شکرِ کشتہٴ درگزرِ محفلِ نسِ روا

ذلتِ ذرّہ ساغرِ سے نہ اندازِ نیرنگ ہے
گردِ شبنمِ بہ چمک اُسے سیٹا اُشنا

دردِ دل لکھوں کیوں کر جاؤں اُن کو دکھاؤں
انگلیاں نگارِ اپنی غامِ طعن چلاں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمنِ آسمان اپنا

بنٹے ہے جلوہ گلِ ذوقِ تاشا غالب
ہشتم کو چاہیے ہر رنگ میں واہو جانا

چپکے چپکے بے کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شریقی گفتارِ درست

شعِ مجتبیٰ ہے کراؤں میں سے اُشنا ہے
شعلہٴ مشق سے پرشش ہوا میرے لہر

خوں ہے دلِ ناک میں احوالِ تباہ پر مین
اُن کے نامِ ہونے مٹا دینا میرے بعد

نظارہ داغِ علمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
نگہنگی ہے شہسوارِ گلِ غزالی شمع

علم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
برق سے کرتے ہیں روغنِ شمعِ ماقمِ غارِ ہم

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباںِ تگب پیرا ہی جو دامن میں نہیں

دوئی جتنی ہے عشقِ غارِ ویراں ساز سے
انہی بے شمع ہے گر برقِ غریب میں نہیں

غابِ مجننِ شہابِ پلاب میں کبھی کبھی
پتیا ہوں روزِ آبرو شبِ ماتہاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
میراں ہوں پھر شاہد ہے کس حساب میں

جوئے غلِ آنکھوں سے بنے دو کر ہے نامِ ذوق
میں یہ کبھی لاکر شیشِ دو فردزاں جو کین

پہنچشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کر بن کے
اُس کے ہر اکاٹھ سے سے نکلے ہے یہ ادا کر لین

ذکرِ تالافِ نالہ مجھ کو کیسا معلوم تھا ہدم
کہ جو لگا باعشِ افزائشِ دردم و درون وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقی گردن سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار ہام واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبِ شوقِ وصل و شکوہِ جبرائ
خدا وہ ملک کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

چشمِ خوابِ خاموشی میں بھی نوا پر واز ہے
نرم تو کمرے کو دودِ ششہ آواز ہے

خُشِ مجھ کو نہیں دشت ہی سہی
میری دشتِ رزی شہرت ہی سہی

سختی کشانِ خُش کی پڑھے ہے کب خبر
وہ دگ رفته رفته سدا پا اُلم ہوتے

باغب کو دیکھتے تھے کہ ہرگز بے باط
 دانا باغبان رکھ گل فروش ہے

لطف خوام ساقِ ذوقِ صدائے چنگ
 یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گردش ہے

ان اشعار میں دل میں ذوقِ وصل و یار و دل تا جگر کو ساحل
 دیا تے خون ، چارہ سازیِ وحشت ، زنداں میں بھی خیالِ بیابانِ فردو
 تھا۔ آئینہ ہے مہرِ کاغذی ، اندازِ بہنِ نعلینِ بیل ، گردش میں نکل
 خون گشتہ ، سرشکِ آلودہ ، ہرنا تیری مژگان کا ، رنگِ شکستہ ، ٹپکنے
 گل آنے ناز ، جوشِ باور سے شیشے آچھل رہے ، ہرگز بے باط
 ہے سریشہ باز کا ، آوازِ کاوشِ ہم جواں ، سبز کہ تھا دغیز ،
 آئینہ میں دشنہ پنہاں ، اتر میں خبر کھل ، خانِ گرمِ خوام ، پتہ ہاش
 یاں دواں مژگانِ چشمِ رے خون تاب تھا۔ ذوقِ کاوشِ ناخن ،
 زنداں سے گہرائی گئے کیا ، گردشِ اتے بے جا ، شکایتِ اتے
 رنگیں ، جنوں جواں گداتے ، سر پہنہ مژگانِ آہر ، ہر گلِ تر ایک
 چشمِ خونِ نشان ، رنجِ گرانہدیِ ذخیر ، داغِ سرتِ ہستی ، شمع
 گشتہ ، در غورِ محفل ، ساغر سے خاؤں نیزنگ ، گردشِ بہنوں بہ چشک
 اتے ہلا آشتا ، آنکھیں فگار اپنی خامرِ خونِ چکاں اپنا ہم کہاں
 کے دن تھے کس بہز میں کیا تھے ، جلوہ گل ، ذوقِ تماشا ، چشم
 کو چاہیے ، شرفِ گفتارِ دوست ، شوقِ مشق سے پوش ہوا ان کے

ناخن ہرے حنا، نشاط داغ فہم عشق، غنبد گل خزانہ شمع
 بیش از یک نس، شمع ماتم خاندہم، ہے گر یہاں ننگ پیرا ہی
 جو دامن میں نہیں، روزنہ ابد شب اجتاب، سجدہ و شاد و مشہور
 غمیں دو دروازاں ہو گئیں، پرکشش طرز دلبری، باعث افزائش
 درد و دل، سنے عشرت کی خواہش، اک دو چار جام واژگون،
 شوق وصل و شکوہ، ہجران، و دو شلہ آواز، میری وحشت زنی شہرت
 ہی سی، سخت کشان عشق ہر گوشہ بساط، دامن باغیاں دکت گل
 فردش، لکھت خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ و نیز کی ترکیب سے
 نکل ابد مروجیت کے چٹے سے چھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں ابد
 جو موتی آجنگ آن کی تناسب اور تناسب و رولبت سے پیدا
 ہوتا ہے وہ فردوس گوش کی حیثیت رکھتا ہے ابد اس کو صرف
 محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

غالب نے شاعری کی زبان میں بڑی دستیں پیدا کی ہیں۔ ان
 کی زبان محدود نہیں ہے۔ وہ صحیح معنوں میں شاعری کی زبان
 ہے۔ اور شاعری کی زبان ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ اس میں زندگی
 کی سی وسعت اور کشادگی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں زبان الفاظ
 کے سحر اور زندہ مجھوے کا نام ہے۔ ان الفاظ میں ان کے
 خیال کا گھوٹ ہے۔ ان کے فکر کی گرمی ہے۔ ان کے جذبے کی
 روشنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں اور
 ان میں بڑی ہی جوفانی کا احساس ہوتا ہے۔ غالب کے استمال
 کئے ہوئے الفاظ صرف الفاظ نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت علامتوں کی

ہے ، اشاروں کی ہے ، جنبیوں کی ہے ، استعاروں کی ہے ۔ وہ
 سیدھے سادے اور پاٹ نہیں ہیں ۔ ان میں تو پلوردار کیفیت
 ہے ۔ ان کی منویت و بہت پہیلی ہوئی ہے ۔ وہ تو رمزداریا کے
 پردے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے ہیں ۔ پھر سب سے بڑی
 بات یہ ہے کہ یہ الفاظ ، میرے کی طرح ترشے ہوئے ہیں ۔ ان
 کو آپس میں ملا کر اور ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم
 آہنگ کر کے آئینوں نے عکسوں کی طرح پر زبان کے ایک نئے رنگ
 آہنگ کی تخلیق کی ہے اور اس طرح انہوں نے شاعری کی زبان
 کو ایک نئی زندگی سے بھکار کیا ہے ۔ اور اس کو نئے آوازوں پر
 پرداز کرنا بھکاریا ہے ۔

یہ زبان اس میں ختم نہیں کہ ادبی زبان ہے اور غالب کا
 فن کارنامہ اسی ادبی زبان کی تخلیق ہے ۔ آئینوں نے اپنی شاعری
 میں جو زبان استعمال کی ہے وہ عام لوگوں کی زبان نہیں ہے ۔
 اس میں تو ایک ادبی مہذب ہے ۔ وہ تو ایک تہذیب کی زبان
 ہے ۔ ایک حایاتی نظام کی زبان ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں
 بشارت چاؤ نظر آتا ہے ۔ بڑی ہی رنگینی اور رخصائی کا احساس ہوتا ہے
 اور بڑی ہی چمکداری دکھائی دیتی ہے ۔ مگر یہ کامیابی اس کی اہم
 خصوصیت ہے ۔ وہ بھی سبائی ہے اور اس میں تہذیب و آرائش
 کا خاص اہتمام کیا گیا ہے ۔ اس میں بانگہی اور طرح داری ہے
 اور اس کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کو بنانے اور سنوارنے
 کی خاص مہد پر کوشش کی گئی ہے اور اس سلسلے میں خاصی محنت

سے کام یا گیا ہے۔ لیکن یہ کوشش اور منت ایک شاعر اور فن کار کی کوشش اور منت ہے۔ اس لئے اس میں تعصّب کا خاتمہ تک نہیں ہوتا۔ بلکہ شروع سے آخر تک ایک فوری رنگ و آہنگ نظر آتا ہے۔

غالب کی زبان میں اُن کا لہجہ بھی خاص ہے۔ اس لیے کے استعمال کی وجہ سے ان کی زبان میں نہ صرف پلورہ کیفیت بلکہ اکثر جگہ ایک ڈرامائی شاعری پیدا ہو گئی ہے۔ اس ڈرامائی شان نے اُن کی زبان کو زندگی سے قریب کیا ہے اور اس میں اصیلت اور درحقیقت کی لہر دوڑا دی ہے۔ یہ اشعار زندگی سے کتنے جبر پڑا اصیلت و واقعیت سے کس قدر ہریز اور آہنگ کے لحاظ سے کس قدر شگرت رکھتے ہیں۔

کتنے ہونہواریں گے ہم دل اگر پڑا پاؤ
دل کاں کو گم کیجئے ہم نے دُعا پاؤ

جان ہے کوئی کشمکش اخذ و عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

کس سے عروسی قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نہ چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

نہیں سلوم کس کس کا سو پانی ٹہرا ہوگا
قیامت سے سرٹکے اکودہ ہونا پیری ہر لکھن کا

کی مرے تل کے بعد اُس نے جنا سے قور
جاتے اُس زودو پشیاں کا پشیاں ہونا

خیف اُس ہار گرہ کپڑے کی قمت غاب
جس کی قمت ہیں ہو عاشق کا گرہاں ہونا

بہوچہ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مڑہلو جنا کسار رہن غانہ مت

ہے نیازی بند سے گزری بندہ پرور کب تک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فراموشی گئے کیا

حضرت ناسخ گرائیں دیدہ و دل (مشق راہ
کوئی کہ کو یہ تو بجا دو کہ بھائی گئے کیا

گر کیا ناسخ نے ہم کو قید اجپایوں سے
یہ جہنم مشق کے انداز بحث ہائیں گئے کیا

ہے اب اس سجدہ میں قیودِ غم اُفت است
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں ہمیں کھائیں گے کیا

سُکھ اچھے غارت گر جنسِ وفا سن
شکستِ شیشِ دل کی صدا کیا

نہ مے نامے کو اتنا دلِ غالب منقر کھ مے
کہ سرتِ سنچے ہوں حوضِ حتم نامے جدائی کا

فائدہ کیا؟ سورج آخر تر ہی رہا ہے اسد
دوستی ناماں کی ہے ہی کا زیاں ہر جائے گا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی سچی قربانی کو کیا جہداشت

بھولی مدت کو غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کریں بھوتا تو کیا مرنے

آئینہ دیکھ اپنا سامنے سے کہے رہ گئے
صاحب کو دلِ زدِ پیچے پر کتنا حزنِ مست

ہو چھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بستوؤ کہ ہم بستہ بھی کیا

نہ لڑنا صبح سے غالب کیا ہوا اگر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زورِ خلعت ہے گریباں پر

نہ گیا چوڑے سرِ غالبِ وحشی ہے ہے
بیشنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

متاثر کر اے جو آئینہ داری
کچھ کس متا سے ہم دیکھتے ہیں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پڑچتا ہوں اُس بتِ بیداوگر کو میں

وہ بھی کہتے ہیں کہ میں بے ننگِ دام ہوں
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

کرنے لکس سڑ سے جو عزت کی شکایت غالب
تم کو بے مہرئی یارانِ وطن یاد نہیں

تم اُن کے دعوے کا ذکر اُن سے کیوں کر غالب
 یہ کیا ہو کم کہو اور وہ کہیں کر یاد نہیں

دل ہی تو ہے نہ ٹلک نہ خست و رہے بجز آئے کیوں
 دہیں گئے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوٹا مٹرا
 تو چہرے شکل تیرا ہی ٹلک آٹاں کیوں ہو

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
 اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی ہے

جلوہ زار آتش و دوزخ ہمارا دل سی
 فتنہ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

ہے دل غریبہ غالب علم ہیچ و تاب
 رجم کر اپنی تنہا پر کہ کس مشکل میں ہے

ہارا زمانے نے اسے اندھاں متیں
 وہ دوسے کہاں وہ جوانی کہ مس گئی

دلِ نادان تجھے ہوا کیا ہے
آخسر اس درد کی دوا کیا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
میں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے ہیں یہ کثر نہ برق میں یہ ادا
کوئی تباہ کو وہ شرخ سنبہ نہ کیا ہے

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو برس تو نہ دے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساتی جو ہم سے نفرت ہے
پیا لہ گر نہیں دیتا نہ دے شہراب تو دے

اسدِ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھڑل گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں واپ تو دے

بہتی ہے نہ کچھ مدم سے غالب
 آخر کیا ہے ؟ اے "نہیں ہے"

ہاں نشاۃِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا
 پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

ان اشعار میں لمبے کی ساحری ہے۔ الفاظ سیدھے سامنے ہیں۔
 زبان صاف ہے۔ لیکن الفاظ اور زبان کا استعمال لمبے کی کسی خاص
 کیفیت اور اس کے مخصوص صوتی آہنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان اشعار
 میں سے ہر ایک میں موضوع کی مناسبت سے بات کرنے کا ایک
 خاص لہر قاتا ہے، اور اس لمبے سے ایک مخصوص صوتی آہنگ
 کی تخلیق ہوتی ہے اور مجموعی طور پر ایک محاکاتی انداز بعض قصروں
 کو آشکارا کرتا ہے۔ ان تصویروں میں اُتھار اور گہرائی کی کیفیت ان تجربات
 پر زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے جو ان اشعار کی پسِ پردہ
 ہیں۔ غالب نے اس لمبے کے استعمال سے دو کام کئے ہیں۔ ایک
 تو یہ کہ ان میں موضوع کا اظہار و ابلاغ پوری طرح ہوا ہے اور
 دوسرے مجموعی طور پر ایسی نفا بھی پیدا کی ہے۔ جو احساسِ جمال
 کی تمکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔ غالب ان اشعار میں ایک چابکدست
 فن کار نظر آتے ہیں۔ کہیں انہوں نے اپنی چابکدستی کا اظہار
 اردو روزمرہ کے استعمال سے کیا ہے، کہیں مکالمے کا انداز پیدا
 کر کے ایک ڈرامائی شان پیدا کی ہے۔ کہیں صرف لمبے کے استعمال سے

ایک مانوس ماحول پیدا کر دیا ہے۔ کہیں بے ساختگی برسیں
اور بے باکی سے ایک خاص نفا پیدا کر دی ہے۔ غرض غالب نے
انفاذ کے مخصوص استعمال سے ہر جگہ ایک مخصوص بے کی تخلیق کی ہے
اور اس مخصوص بے کے استعمال سے ان کی شاعری میں کئی ایسے جاتیاتی
پہلو پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے مجموعی طور پر ان کے فن کو یگانہ اور
طرح داری سے بھنکار کر دیا ہے۔

غالب زبان کے چابک دست فن کار ہیں۔ انہوں نے زبان
کے استعمال کو ایک فن بنا دیا ہے۔ اس میں دستیں پیدا کی ہیں۔ اس
میں اس تہذیب کا رچاؤ پیدا کیا ہے جس کے سائے میں انہوں نے
آنکھ کھولی اور پردہ نش پائی تھی۔ انہوں نے زبان کو خیال اور مواد
کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ اور موضوع کی مناسبت سے زبان استعمال
کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیان زبان کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔
کہیں تخیل کی رنگیں لاریاں ان کی زبان کو رنگیں جاتی ہیں۔ کہیں احساس
کی شدت اس میں گداز کی کیفیت کو پیدا کرتی ہے۔ کہیں وہ عادی کے
اثر سے ایسے لگی کھڑتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے چمن زار سے
سُکراتے ہیں کہیں آدو عادی سے اور روزمرہ کو اس طرح استعمال
کرتے ہیں کہ اس کی سادگی دل میں آ کر جاتی ہے۔ کہیں انفاذ کو حواس
اور اشاروں کا روپ دے دیتے ہیں۔ کہیں رمزیت اور ابیائیت کو
پیدا کرتے ہیں۔ کہیں انفاذ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ان
سے نمکی اور موسیقیت کے چمچ پھوٹنے لگتے ہیں۔ کہیں انفاذ سے
ایسے خطوط بناتے اور ایسے رنگ بکھیرتے ہیں کہ بیان میں مقصدی

کی شان پیدا ہوتی ہے اور اس طرح جو تصویریں تیار ہوتی ہیں ان میں اعتبار اور گہرائی کی وجہ سے حواس کو متاثر کرنے کا ایک عجیب جامد ہوتا ہے۔ ان کی زبان نہایت شگفتہ اور خداداد ہے۔ اس میں تمازگی نظر آتی ہے۔ اس کے زندہ اور متحرک ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بہت سی سیاقی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس میں پُرکاری اور رنگینی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس میں بڑا بالکین ہے بڑی ہی طرح داری ہے۔ بڑی ہی رعنائی ہے۔ بڑی ہی جگمگاہٹ ہے بڑی ہی تابانی ہے۔ اُن کے الفاظ ستاروں کی طرح جگمگاتے ہیں اور زبان چاندنی کی طرح مسکراتی ہے۔

اور یہ صورت حال صرف اس وجہ سے ہے کہ غالب نے اپنے الفاظ میں مسنونیت کی بہلیاں بھردی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو گنجینہٴ معنی کا عظم بنا دیا ہے۔

گنجینہٴ معنی کا عظم اس کو سمجھے
جو لفظ کو غالب مرے اشار میں آئے

ما

غالب کے فن کی اس تفصیل اور اس کے مختلف پہلوؤں کے
 تجزیے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے
 خالقِ جمال اور ایک بہت بڑے فن کار تھے۔ انہوں نے فن کی اہمیت
 کو سمجھا تھا اور وہ اُس کے بنیادی اصولوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔
 ان اصولوں کو برتا ان کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان
 بنیادی اصولوں کو عملی طور پر بڑے سلیستے سے برتا ہے۔ وہ فن
 کی مدایت کے پرستار تھے لیکن اس روایت کو تجربے کے ساتھ ہم
 آجنگ کرنا بھی ان کے پیش نظر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن
 میں روایت اور تجربے کا ایک حسین اور متوازن امتزاج تھا ہے
 وہ سس و بہال کے شیدائی تھے اور زندگی اور فن دونوں میں اس سس
 کی تلاش و جستجو ان کے پیش نظر تھی۔ چنانچہ وہ اس سس و

جمال کی تلاش و جستجو میں سرگرمیاں رہے ہیں اور انہوں نے اس کی تخلیق کو بھی اپنا شہر بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئن کے فن میں حسن و جمال کی تخلیق مختلف طریقوں سے ہوتی ہے اور وہ اس میں مختلف ذراویں سے اپنے آپ کو ردِ نما کرتا ہے۔ وہ ایک تہذیب کی پیداوار ہیں اور اس تہذیب کا جمال ان کے فن میں اپنی تمام رنگینہوں اور رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غائب کے مزاج میں بنات کے عناصر پوری طرح موجود تھے۔ اور طبیعت اور اُفتاد طبع کے اعتبار سے وہ ایک انقلابی تھے۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ انکی روانیت اور دماغ پندی بھی تھی۔ ہر دماغی مزاج فن کار اپنے انہی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ خیال سے مکافئت پیدا کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ وہ ترستقبل میں حُسن دُنیا میں بناتا ہے اور اِن دُنیاؤں کو اپنے تخیل کے رنگوں سے سجاتا ہے۔ وہ صرف سمانے خواب دیکھتا ہے اور انہیں خوابوں کے سلسلے اس کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ غائب نے بھی اپنی روانیت پسندی کی وجہ سے یہی سب کچھ کیا ہے۔ وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتے خوب سے خوب تر کی تلاش میں انہوں نے زندگی اور فن کے اُن گنت سراؤں کی خاک چھانی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے ماضی اور حال سے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے۔ انہوں نے روایت سے بناتِ مزد کی ہے لیکن وہ روایت کے معنی

پلوؤں کی پرستش میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ یہی دوسرے ک
روایت اور دوکان ہندی کے باوجود روایت کا رچاؤ اور اس
کی رنگینی ان کے فن میں اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔
غالب کے فن کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس میں روایت کے اثرات مستند
کے ساتھ اپنے آپ کو روٹنا کرتے ہیں۔

روایت کے اثرات میں جو چیز سب سے زیادہ ان کے
یہاں نمایاں نظر آتی ہے وہ فارسی شاعری کی روایت اور خاص
طور پر اس روایت کے ان علمبرداروں کے اثرات ہیں جن کی شاعری
نے خود اس روایت کو رنگینی اور چمکار بنانے میں نمایاں حصہ لیا
ہے۔ بیدل، گوی، ظفری اور فہرست کے اثرات ان کے فن
میں بہت نمایاں ہیں۔ ان شاعروں نے فارسی شاعری کی روایت
کو جس رنگینی اور چمکاری سے آشنا کیا ہے، وہ عمومی طور پر
سمٹ کر غالب کے فن میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہے جیسے
کسی صحت مند اور توانا جسم میں تازہ اور رخشاں ہوا دوڑتا ہے۔
غالب نے فارسی شاعری کی روایت سے رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات
حاصل کی ہیں۔ اور انہیں اردو شاعری کی فنی روایت کا نمونہ بنا دیا
ہے۔ ان سے قبل اردو شاعری میں مثنوی اور سوری دونوں اشد
سے وہ کشمکش اور شادابی نہیں تھی جو ان کے اعمق پیدا ہوئی۔
غالب کے فن کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اردو شاعری
کی روایت کو ان خصوصیات سے آشنا کیا۔

غالب کے فن میں ایک نشاۃ رنگ اور طریق آہنگ

بھی خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ بظاہر تو یہ رنگ و آہنگ ان کی شخصیت اور آفتاد طبع کا ترجمان اور عکاس ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات بھی ان کے فن میں اس رنگ و آہنگ کو نمایاں کرنے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب سے قبل اس رنگ و آہنگ کی روایت اردو شاعری میں موجود نہیں تھی۔ البتہ فارسی شاعری میں اس کا ایک سلسلہ ملتا ہے اور خاصی تعداد میں شاعر اس مہکان کے علم بردار نظر آتے ہیں۔ غالب کا فن اس ترجمان سے متاثر ہوا ہے۔ اور اس میں نشاط و طرب کی وہ جو ایک چاندنی سی مسکراتی ہوتی نظر آتی ہے اس کا سبب فارسی کی یہی روایت ہے جس کو غالب نے اپنے فن میں کچھ اس طرح داخل کیا ہے کہ اس نے اردو شاعری کی دنیا ہی بدل دی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو شاعری کی روایت سے غالب کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ کہ صرف فارسی شاعری کی روایت ہی ان پر اثر انداز ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ غالب نے اردو شاعری کی روایت سے بھی اثر قبول کیا ہے اور یہ اثرات بھی ان کے فن میں نت نئے روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب سے اہم بات جو اس سلسلے میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آئینوں نے فارسی اور اردو کی روایات کے باہمی امتزاج سے ایک تیسری روایت کو پیدا کیا ہے جو ان کا ایک اہم فن کا نام ہے۔ اس امتزاج نے ان کے فن میں نشاط و المیہ رنگ کی

وصوب چھاؤں کو بُنم دیا ہے۔ غالب نے ان دونوں کو اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ان کے فن میں شلو و جنبہ ایک دوسرے سے نکلے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالب کے فن میں روایت کے اثر سے شرفی کا پہلو بھی نمایاں

ہوا ہے۔ یہ شرفی ظاہر ہے کہ صنف غزل کے مزاج کے ساتھ

مناسبت نہیں رکھتی۔ لیکن غالب کا لانا یہ ہے کہ انہوں نے اس

شرفی کو، اور اس شرفی کے اثر سے پیدا ہونے والے ایک مزاج

اور طرزِ انداز کو غزل کے مزاج میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے،

اور اس کو غزل کے مزاج کا جز بنا دیا ہے۔ اس شرفی اور طرزِ مزاج

کے ضامر غزل کی روایت میں سیخ، واضع اور زاہد کے بیان میں

توڑتے تھے لیکن سخن و عشق اور عاشق و معشوق کے مسائل کے

بیان میں یہ رنگ ذرا مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ غالب پہلے شاعر

ہیں جنہوں نے ان مسائل کے بیان میں بھی اس رنگ کو پیدا

کر دکھایا۔ وہ اس طرح کو غزل کی روایت میں عاشق اور معشوق

کے مسائل سے مستحق ایسے مضامین جو فرسودہ ہو چکے تھے اور

مشکوٰۃ خیر معلوم ہوتے تھے، غالب نے ان کو اپنی غزل میں جگہ

تو دی لیکن اس طرح جیسے وہ ان کا خاکہ اٹھا رہے ہیں اور ان

پر طنز کے بھرپور وار کر رہے ہیں۔ غالب کے اس انداز سے جو

شاعری پیدا ہوئی ہے وہ بہ ذاتِ خود بھی اہم ہے۔ کیونکہ اس

میں بڑی گفتگو کا احساس ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ اہم بات

یہ ہے کہ اس انداز سے غزل کی روایت کو ایک نیا میدان

ہو ہے اور اس میدان میں اس کو ایک اہم صنف سسٹن کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھانے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ یہ صنف ہے کہ غاب کے بعد آنے والے غزل کے فن کار غاب کے اس انداز فن کو پوری طرح برتنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں لیکن غاب نے انہیں وہ راستے مزور دکھا دیئے ہیں جن پر چل کر غزل کی صنف اپنے آپ کو فنی اعتبار سے نئی دستوں سے ہم کنار کر سکتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غاب نے روایت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اور اس کے اثر سے اپنے فن میں نہ صرف رنگینی اور دچاؤ کی خصوصیات پیدا کی ہیں بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اس میں نمایاں ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف غاب کے فن میں بلکہ غزل کی صنف غزل کے فن میں ایک نئے رنگ و آہنگ نے اپنی جگہ بنال ہے۔ لیکن غاب اس روایت کے پرستار نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے فن کو اس روایت کی کیر کا نقیر نہیں بنایا ہے۔ وہ تو اس روایت کے بندھنوں کو توڑ کر اس کے حدود سے باہر بھی نکلے ہیں اور انہوں نے اپنے فن کو بعض نئے تجربات سے بھی آشنا کیا ہے۔ ان تجربات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں توازن ہے اور ان کی جڑیں روایت کی زمین میں پوری طرح بیوست ہیں۔ بہتر جب روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے کہی وقت فن کی دنیا میں اسے حیات جاوداں ملتی ہے۔ غاب نے اپنے بہتر ہے کہ روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ کیا ہے۔ اسی

تھے ان کے فن میں اس کی ایک مستقل حیثیت نظر آتی ہے۔

بات یہ ہے کہ غالب نے اپنے فن میں بہتر ہے کہ یہ پہلا صنف بہتر ہے ہی کی خاطر روخنہ نہیں کئے۔ ان کے پیچھے تو ان کے نئے احساسات اور نئے شعور کا اتنا ہے اور ان نئے احساسات و شعور کی وجہ سے ان کے یہاں وہ نئے موضوعات و مضامین پیدا ہوئے ہیں جن کے انہار و ابلاغ کے لئے انہیں ان تجربات سے کام لینا پڑا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تجربات میں انحراف کا رنگ نظر نہیں آتا اور صرف مناسبت کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنی ایک بنیاد رکھتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شاعر کے خیال، معاد اور موضوع اور اس کے صحیح ہدایتی انہار کے شعور نے پیدا کیا ہے۔ غالب نے بدلتے ہوئے حالات نئے افکار و خیالات اور نئے ہدایتی تعلقات سے ان تجربات کا غیر اثر کیا ہے۔ اسی لئے ان میں ایک استواری نظر آتی ہے اور ایک موانست کا احساس ہوتا ہے۔

غالب کے ان تجربات کی جھلک سب سے پہلے قرائن کی شاعری کے وزن و آہنگ میں دکھائی دیتی ہے۔ غالب نے اپنے موضوعات کی تناسبت سے وزن و آہنگ کو استعمال کیا اور ان میں ایک کمال ہم آہنگی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں بحر کا انتخاب، بعض خاص زمیروں کا استعمال، اشعار کی مضمون و روایت، ترکیبوں کی تراش ان سب میں ان کا تجرباتی مزاج اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب نے یہ سب کچھ اپنے موضوع کے انہار و ابلاغ

کے لیے کیا ہے۔ غالب نے اپنے وزن و آہنگ میں جوشنگلی اور شادابی اور ہلکا آہنگی پیدا کی ہے اور اپنی شاعری کو جس ننگی اور سبکیت سے مدح و تناس کیا ہے، اس کی مثال امداد شامسری میں ان کے قبل نہیں ملتی۔ یوں سوس ہوتا ہے جیسے ان کے فن میں رتن کے چٹھے سے چوٹ رہے ہیں اور غزلوں کے دریا سے سونہریں ہیں غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اس صحتِ حال کو پیدا کر کے اس تجربے کے صوتی آہنگ کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جس کی گہرائی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوع کی مکمل تصویر مع ایک وسیع پس منظر کے آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔

وزن و آہنگ کے اس نئے تجربے کے ساتھ ساتھ غالب نے اپنے فن میں علامتوں اور اشاروں کے استعمال کا بھی ایک اہم تجربہ کیا ہے۔ علامتوں اور اشاروں کا استعمال تو غالب سے قبل بھی امداد شاعری کی روایت میں عام تھا۔ خصوصیت کے ساتھ غزل کے فن میں اس کی ایک روایت موجود تھی۔ لیکن غالب نے اس روایت کو کچھ اور بھی استوار کیا۔ انہوں نے غزل کی روایتی علامتوں اور اشاروں میں نیا طرزِ زندگی دوڑایا۔ اور اپنے وسیع اور ہر گیر موضوعات کو ان کے ذریعے سے ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ روایت علامت و اشارات نئی معنویت سے آشنا ہوئے۔ اور ان کے دامن میں نئی دستیابی پیدا ہوئی۔ لیکن غالب اپنے موضوعات کی گہرائی اور گیرائی کے پیش نظر اپنے اظہار و ابلاغ کو صرف ان علامتوں

اور اشاروں ہی تک محدود نہیں کر رکھتے تھے انہیں اپنے انفراد
 ابلاغ کے لئے کچھ نئے اشاروں اور علامتوں کی ضرورت بھی تھی ۔
 چنانچہ انہوں نے ان نئی علامتوں اور اشاروں کو تخلیق بھی کیا ۔ یہی
 اس میں بھی ان کی مقامی اور ایجاب پسندی کو دخل نہیں تھا ۔ اس کا
 نتیجہ بھی ان کے موزعات کا انفراد ابلاغ اور اس انفراد ابلاغ
 کا جابجائی احساس و شعور تھا ۔ اسی احساس و شعور کے زیر اثر انہوں
 نے مبینہ ایسی علامتوں سے کام لیا جو ان کی جذباتی اور ذہنی کیفیت
 کے ساتھ مناسبت رکھتی تھیں ۔ غالب زمانے کے ذلم خوردہ تھے ۔
 ان کی زندگی میں باوجود سنگسار اور شادابی ' تیزی اور تندی ' جھلنی اور
 طرازی کے ایک سنگسار والی کیفیت تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے
 اس صحت حالات کی مناسبت سے خون ، آگ ، دھواں اور شر
 و فہر کے نئے اشاروں اور علامتوں سے کام لیا اور ان کے ذریعے
 سے اپنے فنی میں انفراد ابلاغ کا ایک نیا عالم پیدا کیا ۔ پھر ایک
 بات یہ بھی ہے کہ اپنی اس ذہنی کیفیت کے باوجود وہ زندگی سے
 ایسے نہیں تھے ۔ ان کی نگاہیں تو ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا
 منفرد دیکھ رہی تھیں ۔ چنانچہ اس صحت حال نے انہیں ' حر ' ، ' زہر ' ،
 ' خواب ' ، ' بیداری ' ، ' تارے ' ، ' آفتاب ' اور اسی طرح کے بہت سے
 اشاروں اور علامتوں کی تخلیق کی طرف راغب کیا ۔ اور ان علامتوں اور
 اشاروں میں ایسا جادو تھا کہ غالب کے بعد اردو شاعری میں ان
 کے استعمال کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ۔ اور موجودہ دور میں جدید
 سے جدید اردو شاعری نے ان سے انفراد ابلاغ کے سلسلے میں

بڑے بڑے کام لئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کی دنیا ہی بدل گئی۔

یہ سب کچھ غالب کا نئی کا نامہ تھا۔ انہوں نے اردو شاعری میں علامت نگاری کو ایک اسلوب کی حیثیت سے مستقل حیثیت دی اور صرف ابلاغ بلکہ جالیاتی انداز کے لئے بھی اس کو اس طرح استعمال کیا کہ اردو شاعری میں اس نے ایک رجحان کی حیثیت اختیار کر لی اور غالب جالیاتی انداز کے لئے اس رجحان کو برتنے اور عام کرنے میں اس وجہ سے کامیاب ہونے کو وہ اس کی اہمیت کا گرا شعور رکھتے تھے۔ اور ان کے خیال میں ناز و غمزہ کی بات دشمنہ و خفیر میں اور مشاہدہ حق کی گنگو باؤہ و ساغر میں کرنا شاعر کے لئے ناگزیر ہے۔

غالب نے اپنے فن میں رمزیت ابدایا نیت کے ایک نئے انداز کو وجود میں لانے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ غالب سے متسلل اردو شاعری میں رمز و ایما کی روایت تو موجود تھی لیکن اس میں یہ بانگہش نہیں تھا جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوا۔ وہ تہہ داری کی کیفیت پیش تھی جو ان کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ غالب نے اپنے منکر کی نسبت سے اس رمز و ایما کو زیادہ تہہ دار بلکہ کسی حد تک پرچہ دار بنا دیا اور اس طرح اس کی حدیں ابھام سے جا میں۔ یہ ابھام آج کی شاعری کے لئے ایک اسلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب نے آج سے سو سال قبل اس ابھام کو ایک اسلوب بنا دیا۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ ابھام کو انہوں نے اپنے حدود

میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیان بہام سے زیادہ اس کی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور جو ابہام ان کے بیان نظر آتا ہے اس کو ایک لطیف ابہام کہنا چاہئے۔ یہ لطیف ابہام اس رمزیت اور ایمایت ہی کی ایک رُتق یا نثر شکل ہے جس کو غالب نے بڑی باجگدستی کے ساتھ اپنے فن میں بتا ہے۔

اس رمزیت، ایمایت اور لطیف ابہام کی وجہ سے اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب ملا۔ یہ اسلوب غالب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ان کا فن اس اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس اسلوب نے انہیں اپنے زمانے میں بڑی حد تک اجنبی بنا دیا۔ اور اسی لیے وہ اس زمانے میں عام نہ ہو سکا۔ شاید اس وجہ سے کہ غالب ایک عظیم شاعر اور فن کار کی حیثیت سے اپنے زمانے سے قطعاً بنا موصول قبل پیدا ہوئے۔ وہ اپنے زمانے میں خاموش فرماتے۔ انہیں موجودہ دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اُن کا احساس دشواری اور گالیاتی آثار موجودہ دور سے گناہت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ دور میں اس اسلوب نے تقریباً تمام جدید شاعروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور ان کے فن کا عام ماحول یہی اسلوب قرار پایا۔ اس اعتبار سے غالب کی حیثیت ایک ایسے پہاڑ کی جیسے صحن کے دامن میں پردکش پانے والی ہر چیز اس کی محفوس آب و ہوا سے متاثر ہوتی ہے۔

زبان و بیان کو غالب نے بوذات خود ایک فن بنا دیا ہے۔ زبان اس میں شبہ نہیں کہ آثار کا ذریعہ ہے لیکن ایک عظیم شاعر

کے اہل میں اس کی حیثیت ایک فن کی ہوتی ہے۔ ایک ایسا فن جو اہل و ابلاغ کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کے نور کو بکھیرتا ہے اور شاعری میں ایک چراغاں کی سی کیفیت کو پیدا کرتا ہے۔ غالب نے زبان میں ایک استہادی شان پیدا کی ہے۔ اس کو رنگین اور پرکار بنایا ہے۔ اس میں گل بوٹے سے کھائے ہیں۔ اس میں ایک عیب طرح کی گھنگناہٹ اور تابانی سما پیدا کی ہے۔ اس کو ہر سبکی طرح تراشا ہے۔ اس میں نئے رنگ بکھرے ہیں۔ نئے پہلو پیدا کئے ہیں۔ الفاظ کو آسان پر بکھرے ہوئے سادوں کی طرح یک جا کیا ہے۔ اس میں تزیین و آرائش نہیں ہے۔ غزلت کا حسن زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسن کی غزلت اس میں قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ غالب نے زبان کی اصلاح نہیں کی ہے۔ لیکن ایک نئی زبان کو پیدا کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی یہ زبان عام لوگوں کی زبان نہیں۔ اس میں ایک ادبی رنگ و آہنگ ہے۔ اور اس کو صحیح سوز میں شاعری کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ غالب سے قبل شاعری کی زبان میں یہ ادبی رنگ و آہنگ کم تھا۔ وہ بونے کی زبان سے زیادہ قریب تھی۔ غرضی کے اثرات غالب کی پیدا کی ہوئی زبان میں غالب ہیں۔ لیکن ان اثرات کو پیدا کرنے میں ان کی کسی شہسوی کشش کو دخل نہیں تھا۔ غرضی تو ان کے مزاج کا جز تھی۔ اس کا رنگ تو ان کی شخصیت میں رچا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غرضی کا رنگ و آہنگ ان کی زبان میں اجنبی اور ناموافق نہیں معلوم ہوتا۔ برخلاف اس کے کہ تو اس تہذیب کی تمام رنگینوں اور رشتہوں کو سانے لاکڑا

کر دیتا ہے۔ میں نے غاب کو پیدا کیا تھا۔ اور میں کی رنگینیاں اور
 دھنیاں ان سے قبل کئی سو سال تک اس سرزمین پر رنگ بکھیرتی
 رہی تھیں۔

غاب نے اردو شاعری کو ایک ایسی زبان دی جو صرف رنگیں
 اور پیرکار ہی نہیں تھی۔ اس میں احساس کی شدت، جذبے کی صداقت،
 شعر کی گہرائی، شعر کی گیرائی اور نثریے کی پختگی کے کئی اظہار و ابلاغ
 کی بڑی صلاحیتیں تھیں۔ غاب کی شاعری انہیں تمام عناصر سے مبلت
 تھی۔ چنانچہ یہی عناصر اس مضمون زبان کی تخلیق کے عرق ہوئے جو
 غاب کا ایک اجماعی کارنامہ ہے۔ گزشتہ سو سال میں اردو کے
 ان تمام شاعروں کے یہاں یہ زبان اپنی جھلک دکھاتی ہے جن کی شاعری
 میں احساس کی شدت، جذبے کی صداقت، شعر کی گہرائی، شعر کی
 گیرائی اور نثریے کی پختگی کا استخراج صحیح ہمایاتی اظہار کا تقاضا کرتا ہے۔
 (سے) لہذا سے دیکھا جائے تو غاب جدید شاعری اور اس
 کے مختلف نئی رجحانات اور ہمایاتی سہائیات کے پیش رو نظر آتے ہیں۔
 اور ان کے فن اور ہمایاتی اجماع کے اثرات کا رنگ و آہنگ صرف
 جدید شاعروں کی شاعری کو اٹھنے والے درجے کے نثر نگاروں کی نثری تخلیقات
 میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

عزیز غاب بڑے ہی پہلو دار فن کار تھے۔ اردو شاعری
 میں وہ ایک اداسے خاص سے نکتہ سرا جوتے اور ان کا فن پارا بن
 نکتہ دان کے لئے صلائے عام کا پیغام ثابت ہوا۔ انہوں نے اپنے فن
 سے ہمایاتی اقدار کی نئی دنیا بھی پیدا نہیں کی، ان اقدار کو موجود

دور کے مزاج کا عجز بنا دیا۔ چنانچہ مرحومہ زمانے میں غالب کے فن کو جرمِ مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کے فن کو حاصل نہ ہو سکی۔ دورِ جدید میں مختلف خیالات و نظریات اور مختلف اسالیب و اندازِ بیان رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو جن طرح غالب کے فن نے متاثر کیا ہے شاید کسی دور میں کسی دوسرے فن کار نے اس طرح متاثر نہیں کیا۔

اس لئے شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو شاعری کی ہدایت میں غالب کے فن کی حیثیت وہی ہے جو خیر انوائی اعتبار سے کسی ملک میں ایک سر بہ فلک پہاڑ کی ہوتی ہے۔

اوائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارِ این نکتہ دان کے لئے



الف

۱۵۷، ۱۶۱، ۱۶۷، ۱۷۳، ۱۷۹، ۱۸۵	
۱۳۲، ۱۸۳، ۲۳۲، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳	اجام : ۱۶۱، ۱۶۷، ۱۷۳، ۱۷۹، ۱۸۵
آفاق رنگ : ۷، ۷، ۷	۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷
اگری صدا : ۱۹، ۲۰	۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲
المر رنگ : ۱۸۳	اساسی ہلال : ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲
الفاظ : ۲۴۳	آتش : ۲۴۳
ایض : ۱۹، ۲۰	اولی زبان : ۲۵۳
ایجری : ۱۶۷، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۸۳	اڈنا پکڑ : ۳۹
۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸	اردو شاعری : ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱
انماذ بلبل : ۸، ۸	اردو مکتوبہ : ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰
انشاء : ۲۳، ۲۴، ۲۵	استعارات : ۲۰۳، ۲۰۴
اورنگ زیب کا تغیر : ۱۹	اسلوب : ۸، ۱۱، ۱۲
آجنگ : ۸، ۸	اسامیل شید ڈورنٹا : ۲۱
انتخاب : ۲، ۲	اشارہ اور کتب : ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹
انسان فضیلت : ۸، ۸	اشارہ کا انتخاب : ۱۰
ایک رنگ : ۲۵	اصیت : ۵۷، ۶۰
ایمانیت : ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳	اعمال و پانچ : ۲۸، ۲۹، ۳۰

دہلی (دولیم) ۱۵۶

ب

بر ۱۶۳، ۱۶۴

برجی ۱۶۸، ۱۶۹

برہم ۱۹

بیانیہ انشاء ۲۲

بیول: ۲۹، ۱۵۵، ۲۶۷

پ

چلو دار غنیت ۱-۱۶

جائزہ: ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹

۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲

دہلی (دولیم) ۲۱۳، ۲۱۶

دے

کاکل ۲۱

رکیب ترکیبی ۱۸۸، ۲۲۲

تشییات ۲۰۳، ۲۰۴

تقریر ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۳۹

تقریر لاری: ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۸

تقریر (دولیم) ۱۶۰، ۱۶۷، ۱۶۸، ۲۰۰

۲۰۴، ۲۰۷، ۲۱۳، ۲۱۶

تقریر: ۱۲۰، ۱۲۱

کشیات ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۷

تقیدی تجزیہ ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲

تقیدی خیالات: ۱۰

تہذیب ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵

تہذیبی روایت: ۱۹، ۲۰، ۲۱

ج

جہان مسدود ۲۱

جہت ۱۶۷

جہت کے عناصر: ۱۶۰

جہات ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶

جہاتی پیلو ۱۱۹، ۱۱۰، ۱۱۱

جہال آفرینی: ۲۳

جہاتی انکسار: ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵

۱۵۷، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲

۱۳۳، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹

ج

حال: ۲۰، ۲۱

حسن حسن پستی: ۲۲، ۲۳، ۲۴

حسن و جمال: ۲۳

حمید احمد خان: ۳، ۴

ن

ذ

زبان: ۲۴، ۱۹، ۲۵، ۲۱، ۲۳، ۲۲

طغیت: ۲۲، ۱

۲۵۳، ۲۵۲، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۴

دیوان غالب (مکمل): ۱۹۲، ۸۳

زبان دریائی: ۱۹، ۲۵، ۲۱، ۲۱۴

ذ

زمین، زمینیں: ۸۹

ذکر یکس (س): ۲۱۵

س

ذ

سادگی: ۶۰

ذوق: ۲۵

سدا: ۲۲۱

س

شیداد برپوش (سدا): ۲۱

رویت: ۹۵، ۹۵

مشق

رویت و قرانی: ۹۵، ۹۵

شعریں غالب: ۱۶۰

مزیّت: ۱۹، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹

شعرا و شاعران: ۸۳

۱۹۳، ۱۵۲

شاعری: ۷۱

روایت: ۱۹، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱

شعرا و شاعران کی کاری: ۷۱

۲۷۰، ۲۶۹

شاعری کی زبان: ۱۲۱

روایت اور بنیاد: ۲۶۷

شاعرانہ سدا: ۱۹، ۲۰

روایت کے اشارات: ۲۶۷

شاعرانہ تغیر: ۲۵

روایت پسند: ۲۷

شخصیت: ۲۷۰

روایتی: ۵۶، ۷۲

س

روایتیت: ۲۷

سوق آجک: ۲۶۱

روایتی فن کار: ۲۸

ویژہ (سربٹ): ۱۵۶

ط

طریقہ جنگ : ۱۲۳، ۱۲۸

طنز : ۱۲۴، ۱۲۶

طنز و مزاح : ۱۲۴، ۱۲۶

ظ

ظرافت : ۱۴۴، ۱۴۵

ظہوری : ۱۲۹، ۱۲۹

ح

حرفی : ۱۲۱، ۱۲۶

حقیقت با حقیقت : ۲۲، ۲۴، ۲۴، ۲۵

۱۲۴، ۱۲۸

حقیقت : ۱، ۲۵

حکایت : ۱۶، ۱۶، ۱۶، ۱۶

حکایت و اشارات : ۱۱۶، ۱۱۶، ۱۱۶، ۱۱۶

۱۲۱، ۱۲۱، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۲۹، ۱۲۹، ۱۲۹

حکایت پسندی : ۱۴۵

حکایتیں : ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴

۱۴۵، ۱۴۵

حکایت کے اشارات : ۱۰۵، ۱۱۲

حکایت ایمانیات : ۱۴۵، ۱۴۵

حکایت و بیان : ۲۱۵، ۲۶۲

خ

خالدی، احمد : ۲۲

خالدی، احمد : ۲۳۸، ۲۳۹

خالدی : ۱۹۵، ۱۹۸، ۱۹۹، ۱۹۹، ۱۹۹

۱۹۴

خالدی، انسانیت : ۲۳

خالدی : ۱۱۵، ۱۱۵، ۱۱۵

خالدی، عظیم شاعر : ۵

خالدی، پند و برد : ۵۸

خالدی، پند و برد : ۱۵۰

خالدی، حسن پستی : ۲۴۰، ۲۴۰، ۲۴۰

۱۴۴

خالدی کی زبان : ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲

۲۳۲، ۲۳۲، ۲۳۲

خالدی : ۱۹۰، ۱۹۰

خالدی و اشارات : ۱۳۱، ۱۳۱

خالدی شاعری کی روایت : ۱۲۹، ۱۲۹

خالدی، صفر : ۲۸

خالدی : ۱۹۰، ۱۹۰، ۱۹۰، ۱۹۰، ۱۹۰

۲۹، ۲۴، ۲۴، ۲۴، ۲۴، ۲۴

کورج : ۱۰۷۰

گے

گوشے : ۲۱۶

ل

لال ملک : ۲۱

لبر : ۲۵۲ ، ۲۶۰

م

مترجم کیفیت : ۱۹۶ ، ۲۴۴

مزاج : ۱۱۴

مزاہر اور مزیہ افغان : ۲۶۹

معنی : ۲۲۲ ، ۲۲۳

مظاہر قدرت : ۳۵

مخلوق کا دور آفرین : ۲۰ ، ۲۱

موسیقیت : ۸۸ ، ۸۹ ، ۸۴ ، ۷۸

۲۴۲ ، ۲۴۵ ، ۲۷۲

موضوعات : ۴۲ ، ۴۳ ، ۶۶

موضوعات کا تنوع : ۲۳ ، ۴۳ ، ۶۶

موتن : ۲۶

میر : ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۲۱

میر کی روایت : ۲۳

۱۳۸ ، ۱۳۹ ، ۲۴۴ ، ۲۶۵

موضوعات : ۴۲ ، ۴۳

وزن و آہنگ : ۷۱ ، ۱۰۳

غزل کی روایت : ۱۱۴ ، ۱۱۵ ، ۱۱۹

۱۳۴

غنائیت : ۲۴۳

ف

فارسی اور اردو زبان : ۲۴۰ ، ۲۴۴

(انصال و استخراج)

فارسی شاعری : ۱۹ ، ۲۲۴ ، ۲۴۲

۲۴۴ ، ۲۶۷

فکر و شعور : ۶۱

فکری آہنگ : ۷۱

فکری منظر : ۲۸ ، ۲۹

فلسفہ و اخلاق : ۳۶ ، ۶۶ ، ۱۳۰

فلسفہ و تحلیل : ۳۵ ، ۶۱

فلسفہ و میلان : ۱۲۰ ، ۱۳۹

فنی : ۲۳ ، ۲۶ ، ۷۷

فنی روایت : ۲۴ ، ۶۱ ، ۱۱۴

کے

کار و بار شوق : ۵۴

ذ

ذاسخ: ۲۲، ۲۳

ذسل: ۲۲۳

ذسل برزی: ۲۵

ذشاید رنگ و رنگ: ۲۲، ۲۳، ۲۴

۲۸، ۳۸، ۵۵، ۶۶، ۶۷

ذغیری: ۲۹، ۶۶

ذنگلی: ۸۳، ۸۸، ۸۹، ۹۳

۱۲۵

ز

زود سجد شود: ۸۴

زونی و رنگ: ۴۱، ۴۲، ۸۳

۹۳، ۶۶، ۶۷، ۶۸

زولیم ایسن: ۱۵۶

ح

حبرث روث: ۱۵۶

حج آهنگی: مزنوع ارفی، ۳۱

ی

یئیس (دیلیر-لی): ۱۲۲

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتابیں

۱۔ اردو تنقید کا ارتقار	۱
۲۔ تنقیدی زاویے	۲
۳۔ روایت کی اہمیت	۳
۴۔ غزل اور مطالعہ غزل	۴
۵۔ خطبات عبدالحق	۵
۶۔ مقدمات عبدالحق	۶
۷۔ تنقیدی تجربے	۷
۸۔ شاعری اور شاعری کی تنقید	۸
۹۔ جدید شاعری	۹
۱۰۔ مومن اور مطالعہ مومن	۱۰
۱۱۔ کلیات میراج مقدمہ	۱۱
۱۲۔ سحر البیان — تنقیدی مطالعہ	۱۲
۱۳۔ غالب اور مطالعہ غالب	۱۳
۱۴۔ غالب کا فن	۱۴
۱۵۔ اقبال کی اردو نثر	۱۵
۱۶۔ اقبال — احوال و افکار	۱۶
۱۷۔ میر تقی میر — حیات اور شاعری	۱۷
۱۸۔ جہان میر (ادبی سوانح)	۱۸

۱۹	_____	ولی اور نگ آبادی
۲۰	_____	حضرت خواجہ میر درد دہلوی
۲۱	_____	نادر دہلوی، خواجہ میر درد دہلوی
۲۲	_____	خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبادت
۲۳	_____	افسانہ اور افسانے کی تنقید
۲۴	_____	ادب اور ادبی تدبیریں
۲۵	_____	تنقید اور اصول تنقید
۲۶	_____	جشنِ اقبال نئی دہلی
۲۷	_____	جشنِ نامہ اقبال (اُردو)
۲۸	_____	جشنِ نامہ اقبال (انگریزی)
۲۹	_____	پاکستان کے تنہا سانس
۳۰	_____	نزدان شوق (شاعری)
۳۱	_____	آرامانِ عشق
۳۲	_____	جلوہِ باغِ صدرنگ
۳۳	_____	یارانِ دیرینہ
۳۴	_____	شجرِ پختہ سایہ دار
۳۵	_____	ڈاکٹر گلبرگ کی نقیص (انگریزی)
۳۶	_____	مخوار دانش (حیدری)
۳۷	_____	دیوانِ دلا
۳۸	_____	دیوانِ حیدری
۳۹	_____	ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک
۴۰	_____	ترکی میں دو سال
۴۱	_____	دیارِ حبیب میں چند روز

جہانِ غالب



ڈاکٹر عبادت بریلوی

کی

نئی کتاب جس میں غالب کی زندگی کے حالات ،
اُن کی شخصیت ، ماحول ، تصانیف اور اُن کے فکرو فن
کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔



ملنے کا پتہ

ادارۂ ادب و تنقید

۸۸- این، سمن آباد، لاہور



ڈاکٹر عبادت بریلوی

۱۴ اگست ۱۹۴۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ ہی میں حاصل کی۔ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ای۔ اے آنرز، ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ ۱۹۴۳ء میں اینگلو عربک کالج دہلی یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو زبان اور ادب کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ۱۹۶۲ء میں لندن گئے

اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز یونیورسٹی آف لندن کے شعبہ ثقافت ہند و پاکستان میں پانچ سال تک اردو زبان و ادب کے استاد اور ادبی تحقیق کے نگران کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں وطن واپس آئے۔ آجکل پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔

تصانیف

- (۱) تنقیدی زاویے (۲) اردو تنقید کا ارتقا (۳) روایت کی اہمیت
- (۴) غزل اور مطالعہ غزل (۵) تنقیدی تجربے (۶) جدید شاعری (۷) مومن اور مطالعہ مومن (۸) شاعری اور شاعری کی تنقید (۹) غالب اور مطالعہ غالب (۱۰) غالب کا فن (۱۱) خطبات عبدالحق (۱۲) مقدمات عبدالحق (۱۳) کلیات میر (۱۴) شکستہ کلام علی جوان (۱۵) ہفت گلشن مظہر علی خاں ولا (۱۶) مادھونل اور کام کندلا - مظہر علی خاں ولا (۱۷) مختصر کہانیاں - سید حیدر بخش حیدری (۱۸) دیوان حیدری (۱۹) تذکرہ حیدری (۲۰) گازار چین - خلیل علی خاں اشک (۲۱) رسالہ کائنات - خلیل علی خاں اشک (۲۲) چار گلشن - بیٹی نارائن جہاں (۲۳) دیوان مبتلا - عید اللہ خاں مبتلا (۲۴) ممتاز الامثال - نواب فیض علی خاں ممتاز (۲۵) انتخاب خطوط غالب (۲۶) مرثیہ جرات (۲۷) ارض پاک سے دیار فرنگ تک -